بیادگار بطلِ حریت رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب لدھیانوی نوراللہ قبرہ

فون نمبر ۷۸۷ — تعلیماتِ اسلامیہ کا داعی — رجسٹرڈ نمبر پی ۴۵۳

پندرہ روزہ الحبیب لدھیانہ

رئیس الاحرار نمبر
رحمۃ اللہ علیہ

رئیس التحریر
مفتی محمد احمد رحمانی

مقام اشاعت:۔ جامع مسجد چونگراں جیل روڈ لدھیانہ

قیمت ایک روپیہ

مولینا حبیب الرحمان لدھیانوی

(علامہ انور صابری)

روشنی سے جس کی روشن دیدۂ احرار تھا
دِل نہ تھا سینے میں جس کے شعلۂ بیدار تھا

جس کی قربانی ہے تاریخِ وطن میں یادگار
جس کے ہر اک عزم کی بنیاد تھی باطل شکار

جس کے ہونٹوں کی ہنسی بھی درد کی تصویر تھی
قسمتِ مزدور کا سرنامۂ تقدیر تھی

تھا سراپا اضطراب دردمندانِ وطن
جانتے تھے جس کو سب جسمِ وطن جانِ وطن

ذکر پر جھکتا ہے جس کے دِل کا فرقِ احترام
اس کی رُوحِ پاک پر انور مرے لاکھوں سلام

جس کے ایثار سے ملّت کی دو بالا ہوئی شان
اُس جماعت کے ہیں سردار حبیب الرحمان

(مولانا ظفر علی خان مرحوم)

رجسٹرڈ نمبر پی ۳۵۸ ٹیلیفون نمبر ۷۸۷

پندرہ روزہ

الحبیب

لدھیانہ

جلد نمبر ۲ —— شمارہ نمبر ۳

۱۶ مئی ۱۹۶۲ء

رئیس التحریر

مفتی محمد احمد رحمانی

•

بدل اشتراک

سالانہ تین روپے ششماہی دو روپے

فی پرچہ ۱۳ نئے پیسے

مقام اشاعت :- جامع مسجد چونگراں - جیل روڈ لدھیانہ

یادِ حبیب

مدتوں روئیں گے ارباب وفا تیرے لئے
عمر بھر کا داغ ہے یہ ایک دو دن کا نہیں

دار فانی سے سبھی کو جانا ہے۔ لیکن جب کوئی بزرگ شخصیت دنیا سے ہمیشہ کے لئے سفر کرتی ہے۔ تو آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ دل چلا اُٹھتے ہیں۔ بستیاں ویران نظر آتی ہیں۔ اور پورے عالم پر رنج و الم کا ایک عالم طاری ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے بزرگوں کا تعلق کسی خاص خاندان یا افراد سے نہیں ہوتا۔ بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کے لئے یہ مشترکہ سرمایہ ہوتے ہیں۔ اسلئے ان کے چلے جانے سے ہر انسان کو دُکھ اور تکلیف پہنچتی ہے۔ اور پوری انسانیت کو نقصان ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کی بے راہ روی اور گمراہیوں کے امکانات وسیع ہو جاتے ہیں۔ رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کی شخصیت ایسی ہی تھی۔ موجودہ دور میں وہ علم وفضل، تقوےٰ وطہارت، نیکی و پاکیزگی کا مجسمہ تھے۔ اور ایک ایسے سچے انسان تھے۔ کہ جن کا ظاہر و باطن ہمیشہ یکساں رہا۔ اور جس نے اپنی ساری عمر قومی اور ملی خدمات کے لئے وقف کر دی تھی۔ ایسے ہی بزرگوں کی موت کو (موت العالِم موت العالَم) کہا جاتا ہے۔ ان بزرگوں کی موت حقیقت میں ان کی اپنی موت نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی موت پوری دُنیا کی موت ہوتی ہے۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان نور اللہ مرقدہٗ کا پنجاب ہی میں نہیں۔ بلکہ ہندوستان کے ان مشہور سیاسی، مذہبی رہنماؤں میں شمار ہے۔ جن کے نام انگلیوں پر گنے جاتے ہیں۔ آپ نے جون ۱۸۹۲ء

مطابق ۱۱ صفر ۱۳۱۰ ہجری کو مفتی اعظم پنجاب حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گھر پیدا ہوئے جو کہ وقت کے بڑے زبردست عالم اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ آپ نے صرف تین ماہ کے اندر قرآن پاک حفظ کیا۔ اور رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو لدھیانہ کی مشہور دو منزلی مسجد میں ایک ہی رکعت میں چھ گھنٹے میں سنایا۔ رئیس الاحرار کا خاندان مشہور علمی، سیاسی اور مذہبی خاندان ہے۔ صدیوں سے آپکے خاندان میں علم عرفان نسلاً بعد نسلاً چلا آرہا ہے۔ آج کے زمانے میں بھی ۲۹ افراد اس عظیم الشان خاندان کے ایسے ہیں کہ جنہوں نے ہندوستان کی مشہور علمی درسگاہ دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ حاصل کی ہیں۔ اور اپنے اکابر کی طرح یہ علماء بھی ملکی، ملی تنظیمات میں معروف ہیں۔ اور دیانتداری سے اپنے فرائض کو سرانجام دے رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں رئیس الاحرار کے جد امجد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے انگریزی سامراج کے خلاف باقاعدہ جنگ کی۔ اور لودیانہ فتح کیا اور سب سے پہلے ملک کی سرزمین پر مولانا کے بزرگوں نے ہی قومی پرچم لہرایا — فتح لدھیانہ کے بعد سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی امداد کیلئے آپ دہلی پہنچے۔ اور آخری وقت تک انگریزی سامراج کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی افواج کو شکست ہوئی۔ اور حضرت شاہ صاحب کو دہلی کی بجائے روپوشانہ ضلع پٹیالہ کے جنگلوں میں قیام کرنا پڑا۔ اور وہیں آپ نے انتقال فرمایا۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کی گئی۔ رئیس الاحرار کے دادا حضرت مولانا شاہ محمد صاحب میدان سیاست میں آئے۔ اور آل انڈیا نیشنل کانگریس میں شامل ہونے کا فتویٰ دیا۔ اس فتوے کو ہندوستان بھر میں قبول ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کو وقت کی ضرورت اور صحیح رہنمائی سمجھتے ہوئے۔ پانچ سو علمائے ہند نے اس کی تصدیق بھی کی۔ آج سے ۷۷ سال قبل انگریزی اقتدار سے ٹکر لینا مولانا ہی کے بزرگوں کا کام تھا۔

۱۹۲۱ء کی تحریک آزادی میں آپ کو پہلی مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ اور آزادی ہند کے جرم میں رئیس الاحرار کو دو سال جیل میں رہنا پڑا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک ملک و ملت کے لئے آپ نے قربانیاں دیں۔ اور پورے پندرہ برس قید و بند میں گذارے۔ آخری مرتبہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں لاہور سے گرفتار ہوئے۔ اور مئی ۱۹۴۵ء کو رہا کئے گئے۔ جون ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کا بھیانک اعلان ہوا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پنجاب کے دونوں حصوں میں انسانی خون کے ساتھ ہولی کھیلی جانے لگی۔ رئیس الاحرار کو حالات کی خرابی کی بنا پر اپنا عزیز شہر لدھیانہ چھوڑ کر دہلی جانا پڑا۔ اور لدھیانہ کی بجائے دہلی رہائش اختیار کرنی پڑی۔

۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کی صبح کو یہ آفتاب حریت ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ ان کے انتقال سے ملک و ملت کو بھاری نقصان پہنچا۔ ان کا وجود ملت کا بہت قیمتی سرمایہ تھا۔ جو مذہبیت اور دینداری کے ساتھ ملکی اور قومی خدمت۔ ایثار اور قربانی کی تاریخ بھی رکھتا تھا۔

رئیس الاحرار کے انتقال کو چھ برس ہونے کو ہیں۔ لیکن وہ کون ہے۔ جو کہے۔ کہ رئیس الاحرار انتقال کر گئے کیونکہ ان کا جاری کردہ مشن آج بھی اسی طرح جاری ہے جس طرح ان کی زندگی میں تھا۔ اور خدا نے چاہا تو ان کا یہ مشن ہمیشہ جاری رہے گا۔

خدا کرے رہے زندہ سدا پیام تیرا
ہر ایک دور میں چلتا رہے یہ نام تیرا
(رحمانی)

پنجاب کیلئے ہادی اور مربی دین رہا

۲۵ محرم ۱۳۷۶ھ اتوار کا دن بہت ہی المناک دن تھا۔ جبکہ ۹ بجے صبح کو فون پر اطلاع آئی۔ کہ مولانا حبیب الرحمان صاحب لدھیانوی کا حرکت قلب بند ہوجانے سے اچانک انتقال ہوگیا۔ مولانا ممدوح علمی گھرانے کے ایک لائق رکن تھے۔ اُن کا خاندان پنجاب کے لئے ہادی اور مربی دین رہا ہے۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ حریت و آزادی کا پوری قوت اور ہمت سے علمبردار۔ مولانا ممدوح اپنی خاندانی روایات کے ماتحت ایک ذکی عالم، مفکر اور سیاسی مزاج کے رہنما تھے۔ معاملات میں گہرائی کے ساتھ سوچتے تھے۔ ملک کی آزادی میں اُن کا زبردست حصہ تھا وہ پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے طبقے اور اُن کے رفقاء سیاسی میں سے تھے۔ ملک کے ان دونوں رہنماؤں کو ان پر کافی اعتماد تھا۔ مولانا کے جنازہ میں شرکت کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان نے اپنے سیکرٹری کو اس پیغام کے ساتھ بھیجا۔ کہ مولانا حبیب الرحمان کی وفات سے ملک ہی کا نقصان نہیں ہوا بلکہ میرا ذاتی نقصان بھی ہوا ہے۔ مولانا ممدوح سیاسی میدان کے ایک بہادر اور انتھک سپاہی تھے۔ عمومی سیاسیات اور بین الاقوامی معاملات میں ذی اثر تھے۔ اور ہر بنیادی مسئلہ میں ان کی ایک نکھری ہوئی رائے تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب اور دینی معاملات میں نہایت پختہ اور متصلب تھے۔ دیانت و سیاست میں ان کے یہاں حدود تھیں۔ اور وہ ان حدود کے سختی سے پابند تھے۔ با اصول اور منفرد شخصیت رکھتے تھے۔ میرا اُن کا تعلق شخصی نہیں بلکہ خاندانی نوعیت کا تھا۔ موقعہ بموقعہ ہمارے اہل بیت اور دیانتہ میں اُن کے یہاں مقیم ہوتے تھے اور گھر جیسا معاملہ تھا۔ میرے ساتھ خصوصیت سے ممدوح کو مخلصانہ محبت تھی اور حاضر و غائب خیر خواہی فرماتے تھے۔

دار العلوم دیوبند کے ساتھ ممدوح کو خاص شغف تھا اور اس کے بارے میں بہت اچھے اچھے معقول اور نیک مشورے پیش فرماتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے بھی کہ وہ دار العلوم کے ایک فیض یافتہ تھے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ اُوپر سے ان کے خاندان کے بزرگوں کو بزرگان دیوبند سے خصوصی ربط اور علاقہ تھا۔ دینی مسلک اور سیاسی مشرب میں سب ایک دوسرے کے ہم نوا تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے پہلے جس بزرگ نے کانگرس میں شامل ہوجانے کا فتوےٰ دیا وہ ان کے دادا حضرت مولانا شاہ محمد صاحب قدس سرہ العزیز تھے۔ اس کے بعد پھر حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی یہی فتوےٰ دیا۔ اس سے ان بزرگوں کی فراست اور جوشِ بغض فی اللہ واضح ہے یہی اثر مولانا حبیب الرحمان اور ان کے خاندان کے دوسرے ممبروں میں رچا ہوا تھا۔ سیاسی معاملات میں ان کی گفتگو نہایت جوش اور حرارتِ ایمانی کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ دو متضاد کیفیتوں کے بیک وقت حامل تھے۔ ایک طرف دین میں تصلب اور شدت کے ساتھ اس کے دائرہ میں محدود بنکر رہنا۔ دوسرے سیاسی لائن میں وسعت جسکے دائرہ میں مسلم اور غیر مسلم یکسانی کے ساتھ جمع ہوسکیں۔ چنانچہ ان کی مجلس میں دونوں قسم کے افراد کا اجتماع رہتا تھا۔ ایک

جانتے، ذاتی طور پر ہر قسم کے لوگ بھی ان سے مانوس تھے اور دوسری طرف سیاسی سلسلوں سے ہندو، مسلم، سکھ سب کی ان کے پاس آمد و رفت تھی اور اس سے زیادہ حیرتناک بات یہ تھی، کہ یہ سیاسی لوگ سیاسی لائن سے ہی ان کے پاس آتے تھے مگر ساتھ ہی ان کی مذہبیت سے متاثر اور ان سے ایک مذہبی مقتدا کی حیثیت سے بھی دیکھتے تھے۔ مولانا مرحوم ان اثرات کو دین کے حق میں استعمال فرماتے تھے۔ اور تبلیغ حق کے فریضہ کو باحسن اسلوب ادا فرماتے رہتے تھے جس طرح سے کہ نفسیات کا ایک ماہر اپنے کام کو انجام دیتا ہے۔ مولانا نے ایک دفعہ ہندوؤں کے سامنے اذان کی حقیقت اس انداز سے بیان کی۔ کہ بہت سے ہندوؤں کی خواہش ہوئی۔ کہ اذان کا ہندی میں ترجمہ چھپوا دیا جائے۔ مولانا نے ہندی میں اس کا سلیس ترجمہ کروا کر عربی اذان اور ہندی ترجمہ ایک خوبصورت پمفلٹ میں چھپوایا۔ جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوا۔ اور اس کے گاہک سب کے سب ہندو تھے۔ جنہوں نے بخوشی دلی اُسے لیا۔ اور اپنے بچوں کو یاد کرایا اور سمجھایا اسی طرح سے وُہ اسلامی مسائل کو سیاسی رنگ سے پیش کر کے اُسے منوا لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ممدوح حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری سلمہ اللہ تعالیٰ بیعت بھی تھے اور حضرت کے دینی ارشادات گرامی کے سختی کے ساتھ پابند اور اُسے حرز جان بناتے رہتے تھے۔ ان کے ہر قول و عمل سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے قلب میں دین کا رسوخ کافی ہو چکا ہے۔ اور ان کی یہ بات خواہ وہ سیاسی رنگ کی ہی ہو۔ دین کے جذبہ سے خالی نہ ہوتی تھی۔ تبلیغی سلسلہ میں نہایت ہی مفکرانہ مشورے دیتے تھے۔ بہر حال ایک طرف عملی رنگ لئے ہوئے تھے۔ دوسری طرف سیاست میں گہرے رسوخ کے حامل تھے۔ جس کی باتیں مسلم اور غیر مسلم دونوں کے جذبات کو اپیل کرتی تھیں۔ اور ایک سمت صوفی منش بھی تھے۔ جس سے اہل اللہ اور انکی نسبتوں کی عظمت سے اُن کا دل لبریز معلوم ہوتا تھا۔ یہ متضاد خوبیاں جمع رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں

کا حق تعالیٰ نے ظہور فرما دیا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ حق تعالیٰ شانہ ان کی اولاد اور پسماندوں کو ان کے نقش قدم پر چلائے۔ ان سب کے جذبات بھی بحمد اللہ دینی ہیں جو ان کے خاندان کا ورثہ تھے۔ اور امید ہے کہ ان کی اولاد میں سے بعض فضلاء آخر کار اپنے بہترین باپ کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ یہ چند سطریں اذکر و احساس موت کے تحت بطور مطلوب لکھی گئیں۔ ورنہ ایسی ہمہ گیر شخصیتوں کا غم و الم چند سطروں کی حدود میں کہاں سما سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے صدمات محض خاندانی یا قبائلی نہیں ہوتے بلکہ قومی اور ملکی ہوتے ہیں۔ جن کو سطریں نہیں سمیٹ سکتیں دل ہی برداشت کرتے ہیں۔ ہم سب خدام دارالعلوم دیوبند ان کا غم دلوں میں لئے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس غم کو وسیلۂ نجات فرمائے اور ہم سب کو حسنِ خاتمہ کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ آمین

ے این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہی چند در چند خوبیاں اور فضائل ہیں جس سے اُن کی ہستی دلوں میں زندہ نظر آتی ہے اور آتی رہیگی۔ حق تعالیٰ نے انہیں حسن خاتمہ کی دولت سے نوازا۔ مجھے جب کبھی خط لکھتے تھے۔ تو اس میں حسن خاتمہ کی دُعا کے لئے ضرور لکھا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ آرزو پوری فرمائی۔ پاکیزہ موت ہوئی۔ دو تین منٹ میں سب جھگڑا نمٹ گیا۔ کلمہ طیبہ کے درود کے ساتھ اچانک رُوح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ اور موت

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی

وہ جوانی ہو یا بڑھاپا ہو
آپ اپنی مثال ہے دونوں
علم و حکمت برائے آزادی
اُن کی بانیء حال ہیں دونوں
(علامہ انور صابری)

عزیزم رحمانی السلام علیکم و رحمتہ اللہ

مزاج گرامی بخیر ہونگے۔ آپ کے دو گرامی نامے صادر ہوئے۔ تعمیل کر رہا ہوں۔ مگر تاخیر اور اختصار کی ندامت ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بے حد معذور رہا۔ طرح طرح کے کام اس طرح گھیرے ہوئے ہیں۔ جن کی بنا پر مختصر مضمون بھیج رہا ہوں۔ اسی کو قبول فرمائیں۔ اپنی اہلیہ کو سلام فرما دیجئے۔ اور عزیزان حبیب الرحمان، عبید الرحمان و عتیق الرحمان کو پیار اور دُعا۔ والسلام

نیازمند محمد میاں۔ ۷ جنوری ۶۲ء

مجاہد جلیل۔ رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمان کو لدھیانوی کہا جاتا ہے کیونکہ لدھیانہ اُن کا آبائی وطن تھا جہاں اُن کا جدّی مکان بھی تھا۔ اور خود اُن کا بنایا ہوا مکان بھی۔ مگر جو سب کے لئے ہوتا ہے وہ سب کا ہوتا ہے۔ کسی خاص شہر کی طرف اُس کی نسبت کسی تاریخی تقاضے کی بنا پر ہوتی ہے۔ ورنہ ہر شہر اس کا اپنا شہر ہوتا ہے اور وہ آگے بڑھنے سے تو کہنے لگتا ہے۔

ع ہر مُلک، مُلکِ ماست کہ مُلکِ خدائے ماست

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمان کی شخصیت اسی طرح کی تھی۔ مولانا حبیب الرحمان کا وطن اگرچہ لودیانہ تھا مگر اُن کی بُود و باش زمانۂ طالب علمی میں درسگاہوں میں اور آخر میں دارالعلوم دیوبند میں رہی۔ مولانا کا طالب علمی کا دَور ختم ہوا۔ تو وہ مُلک و ملّت کے لئے اسٹیج پر نظر آتے تھے یا جیل خانہ میں بسیرہ کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء تک مولانا حبیب الرحمان کی عمر کا جتنا حصہ گذرا اسی طرح گذرا۔ احقر نے دارالعلوم دیوبند میں عربی شروع کی۔ اس وقت مولانا فارغ ہو چکے تھے۔ مولانا دارالعلوم دیوبند سے چلے آئے تھے۔ مگر اُن کے نام کی شہرت دارالعلوم میں باقی رہی اور وہ برابر بڑھتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ مولانا کسی مخصوص حلقے کے نہیں۔ بلکہ پورے ہندوستان کے مسلّمہ رہنما ہو گئے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد احقر کی عمر کے چند سال آرا، شاہ آباد۔ صوبہ بہار میں گذرے اور عمر کا قیمتی حصہ مُراد آباد میں ختم ہُوا۔ اس پورے عرصہ میں مولانا موصوف کا قُرب میسّر نہیں آیا۔ مولانا آسمانِ شہرت کے ماہ و پروین تھے۔ اور احقر مولانا کو اسی طرح دیکھا کرتا تھا۔ جیسے زمین کے لینے والے چاند ستاروں کو دیکھتے ہیں۔

مجھے مولانا کا قُرب دسمبر ۱۹۴۷ء کی آخری تاریخوں میں میسّر آیا۔ جب مولانا کو بذریعہ ہوائی جہاز مغربی پاکستان (غالباً بہاولپور) سے لکھنؤ بُلایا گیا۔ جہاں ہندیونین کے مُسلمانوں کی وہ مشہور تاریخی کانفرنس ہو رہی تھی جس کو "آزاد کانفرنس" کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے محرک حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ رحمتہ اللہ

لکھنؤ سے مولانا دہلی تشریف لائے اور جمعیت العلماءؒ کے دفتر کی پُشت پر اُس مکان میں قیام فرمایا۔ جو آج کل حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب کا زنان خانہ ہے

حاجی محمد فاروق صاحب سوداگر لیدر کو مولانا سے تعلق پہلے سے تھا۔ اس زمانے میں اور خصوصیت پیدا ہو گئی۔ احقر کو بھی مولانا کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا اتفاق اسی وقت سے ہوا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا۔ مغربی اور مشرقی پنجاب کی آبادیوں کا تبادلہ ہوا۔ مشرقی پنجاب کے تقریباً تمام ہی رہنماؤں کو جو تقسیم کے مخالف تھے مغربی پنجاب جانا پڑا۔ ان میں سے بہت سے ذہنی طور پر پاکستانی سانچے میں ڈھل گئے۔ اور جو ذہنی طور پر نہیں ڈھل سکے۔ وہ عملاً اس سانچے میں کھپ گئے۔ مگر مولانا حبیب الرحمان کی شخصیت وہ تھی جو آخر تک اپنے عقیدہ اور خیال پر قائم رہے۔ ان میں مستقل مزاجی کے ساتھ قائم رہنے کی بڑی جرأت تھی۔ اور یہی ایک رہنما کی وہ پختگی ہے۔ جو تاریخ جاوید کا نقشِ عنوانی بنا کرتی ہے۔ حضرت مولانا کی سوانح حیات مرتب کرنا تو حضرت موصوف کے صالحہ اور رشید اخلاف کا کام ہے۔ جن کو واقفیت بھی احقر سے زیادہ ہے۔ اور خدا نے قوتِ تحریر بھی احقر سے زیادہ عطا فرمائی ہے۔ احقر کے سامنے تو چند بنیادی اوصاف ہیں۔ جن میں مولانا کو امتیاز حاصل تھا۔

(۱) ذہانت۔ مولانا کا مخصوص وصف تھا جس نے آپ کو پوری جماعت میں سب سے ممتاز کر دیا تھا۔ ذہانت کے ساتھ فراست اور سیاسی بصیرت بھی ممتاز خصوصیت تھی۔ اور کوئی بھی سمجھدار شخص پہلی ہی مجلس میں مولانا کی ان خصوصیتوں سے متاثر ہو جاتا تھا۔

سیاسی بصیرت کو مولانا دن بدن ترقی بھی دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ نہ صرف مولانا کا معمول تھا بلکہ احقر جیسے کاہل اور مطالعہ اخبار کے بارے میں جان چور خدام کو تنبیہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ جو شخص مخالف اخبارات کو پابندی سے نہیں پڑھتا۔ وہ کبھی قوم کی خدمت بیدار مغزی سے نہیں کر سکتا۔

مولانا فرمایا کرتے تھے۔ ایک سیاسی رہنما کا نمازِ صبح کے بعد سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ مخالف اخباروں کو دیکھے۔

۲۔ جس وصف نے مولانا کی ذہانت و بصیرت کو جوہری شان بخش دی تھی۔ وہ جرأت، دلیری اور بہادری تھی جو عالم کی سخاوت کی طرح مولانا کے نام نامی کے ساتھ لازوال خصوصیت بن گئی ہے۔ جس نے مولانا کی زندگی کو ہمیشہ مصائب کے شکنجے میں گرفتار رکھا۔

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

۳۔ مولانا کے تصور کے ساتھ جس چیز کا تصور دماغ پر چھا جاتا ہے۔ وہ آپ کی فراخ حوصلگی۔ مدارات اور تواضع ہے۔ جو ہر اس شخص کے لئے عام ہوتی تھی۔ جس کے متعلق وہم ہو جاتا تھا کہ وہ کس حیثیت میں مولانا کا مہمان ہے۔ پھر یہ مدارات عام بھی تھیں۔

برین خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

حضرت مولانا کے ان اوصاف کی برکت۔ یہ تھی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب مولانا نے دہلی میں قیام فرمایا تو یہاں ہر فرقہ اور ہر طبقہ میں وہ ایسے ہی معروف تھے۔ جیسے کوئی مدت ہا مدت سے دہلی میں رہتا ہو۔ پھر جب کچھ عرصے بعد وہ لدھیانہ تشریف لے گئے۔ جس کے متعلق محض خارزار ہونے کا تصور نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے دشت زار ہے وہ لودیانہ میں ایسے ہی مقبول تھے جیسے تحریک کے اس دور میں جب مولانا لودیانہ کے فرمانبردار مانے جاتے تھے۔

دو ماہ ہوئے نومبر کے دوسرے ہفتے میں احقر لودیانہ گیا۔ جہاں مولانا کے فرزندانِ ارجمند مولانا محمد احمد رحمانی فاضل دیوبند اور مولانا سعید الرحمان صاحب حضرت مولانا کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں تو مجھے محسوس ہوا کہ رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب کی یاد اسی طرح تازہ ہے جس طرح ان کی زندگی میں تھی بلکہ مولانا کے صاحبزادگان کے پاس قیام کر کے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کی وفات نہیں ہوئی بلکہ وہ زندہ جاوید ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ۴

ہم دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا کے ان اخلاف کو بھی ایسی زندگی کی توفیق بخشے جو ہمیشہ فنا سے ناآشنا رہتی ہے۔ وما ذلک علی اللہ [illegible]

۱۵ مارچ ۱۹۶۷ء ۷۸۶

جانِ حبیب" محبت نواز رحمانی

اسلام علیکم۔ درجہ اللہ وبرکاتہ "غازی" نے بیشک اپنے رہنمائے بے باک مولانا حبیب الرحمان پر مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن گذشتہ ماہ وہ الیکشن کے جھمیلوں میں الجھا رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ دہلی سے "غازی" کے پٹھان بھائی مہر چند کھنہ اور امروہہ کے حلقہ انتخاب سے حضرت "مجاہد ملت" سرخرو ہوئے۔ اور ان انتخابی فتوحات کے بعد "غازی" وعدہ ایفا کرنے کی سوچ ہی رہا تھا۔ کہ ضلع بلند شہر سے چودھری محمد قمر خاں آن دھمکے مصر ہوئے۔ کہ "غازی" ان کی "قمر لائبریری" کا افتتاح کریں۔ یاد رہے۔ کہ یہ "غازی" کے ہندوستانی بیٹوں میں بہت پیارے بیٹے ہیں ـــــ "قمر" وعدہ لیکر رخصت ہوئے۔ تو بلند شہر خاص سے "سنتوش" آن "براجے"۔ کہ ان کے ساتھ "ہولی" کھیلنے کے لئے "غازی" ۱۷ مارچ کو بلند شہر پہنچیں۔ اور ان کے جاتے ہی لاجپت نگر سے کرشن حسرت لاہوری آ گئے۔ کہ ہولی کی تقریب اور کھنہ صاحب کے اعزاز میں جلسہ ہے۔ اس لئے "غازی" وہاں آکر درشن دیں۔ گویا یک انار اور صد بیمار والا معاملہ ہے۔

دفتر "پرتاپ" میں غازی نے "الحبیب" کا تازہ پرچہ دیکھا۔ اس خاص نمبر میں۔۔۔۔ لکھنے والے مشاہیر کے نام بھی پڑھے۔ اپنا نام نظر نہیں آیا تو سمجھا کہ اچھا ہوا۔ رحمانی صاحب نے معاف کر کے فراموش کر دیا ہے۔ اور اس طرح ایک وعدے سے تو چھوٹے۔ لیکن "غازی"۔ رات کے دس بجے اپنے گھونسلے میں گھر پہنچے تو رحمانی صاحب کا ملفوف پڑا تھا

اے غازی کے "محبوب سردار" کے جانِ "حبیب" رحمانی! اس وقت رات کے ۱۲ بجے ہیں اور "غازی" تعمیل ارشاد میں مصروف ہیں کیونکہ اگر آج کی رات اس نے غفلت میں گذاری تو صبح کو وہ کہیں اُڑ کر چلے جائیں گے اور تعمیل ارشاد نہ ہو سکے گی۔ ـــــــــــــ نیاز مند:۔ خان غازی کابلی

پینتالیس سے پہلے کی بات ہے۔ کہ عروس آزادی کو پنجۂ افرنگ سے نجات دلانے میں جس جماعت نے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کی تھی۔ اس جماعت کا نام "مجلس احرار اسلام ہند" تھا۔ جو افضل حق، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا مظہر علی اظہر سے عبارت تھی۔ "غازی" اس کے ادنیٰ رضاکاروں میں سے ایک تھے۔ اور ع

"اس جماعت کے تھے سردار حبیب الرحمان"

آج ہندوستان عروس آزادی سے ہمکنار ہے۔ لیکن سردار بھگت سنگھ کو دار پر لٹکانے اور مہابان وطن پہ لاٹھیوں سے

مشق ستم کرنے والے دندنا رہے ہیں۔ غدار بنگلوں میں دادِ عیش دے رہے ہیں۔ اور بقول

"جس جماعت کے تھے سردار حبیب الرحمٰن"
اس کے رضاکاروں اور غداروں کے لئے سر چھپانے کیلئے بھی جگہ نہیں۔ اور وہ بحالی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔ اللہ نے نتیجہ بدلا۔ انقلاب ۔

جو لوگ آشنائے وقار بشر نہ تھے
منزل انہیں ملی جو رفیق سفر نہ تھے

افسوس! "مجلس احرار ہند" کی یاد ایک خوشگوار عہد کی خوشگوار یاد بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے "مجاہدانہ" کارنامے پرانے اخبارات کی فائلوں میں دفن ہو کر محو ہو گئے ہیں۔ اور اس کے سردار مولانا حبیب الرحمان "جہاں آباد" (دہلی) کی جامع کے پہلو میں خاک میں پنہاں ہیں۔ آہ! ؎

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

سردار احرار مولانا حبیب الرحمان کے خاندانی تعلق افغانوں سے "شاہ زماں خاں" کے عہد زوال سے چلا آرہا ہے۔ اور شاہ زماں وہی افغان غازی بادشاہ تھے۔ جو انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کی قسم کھائے ہوئے تھے۔ اور جب سلطان ٹیپو کی امداد کے لئے عازم ہند ہو کر لاہور پہنچے۔ تو ان کے خلاف "ولزلی" کے ایجنٹ میر مہدی علی مراد آبادی نے ایران کو اکسایا۔ اور قلب ایشیا میں شیعہ و سُنی منافرت کی آگ روشن کی تھی۔ جس کے نتیجے میں احمد شاہ درانی کے اس بہادر اور انگریز دشمن پوتے کو نہ صرف تاج و تخت سے بلکہ بصارت سے بھی محروم ہونا پڑا۔ آہ۔

آپ کہتے ہیں ہمیں غیروں نے برباد کیا
بندہ پرور یہ کہیں اپنوں کا ہی کام نہ ہو

"غازی" سردار احرار مولانا حبیب الرحمان سے اسوقت سے متعارف ہے۔ جبکہ مولانا تحریک خلافت میں انگریز سے برسرِ جنگ تھے۔ اور ان کے والد حضرت مولانا محمد زکریا۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ہر وقت فکرمند رہتے تھے۔ اور "غازی" مدرسہ یوسفیہ منتیڈھو ضلع علی گڑھ میں جہاں مولانا عرفان صدر مدرس تھے۔ مولانا شمس الدین شمس الوڑی سے پڑھ رہے تھے۔ اور خلافت و کانگریس کے رضاکاروں میں تھے۔ یہاں یہ عجیب بات کچھ دلچسپی سے ہرگز خالی نہیں ہے۔ کہ تمام مشاہیر اور حریت پسندوں کے والدین ان کے خیالات کے بالکل برعکس گذرے ہیں۔ چنانچہ غازی امان اللہ خان شاہ افغانستان انگریز کے دشمن اور شمع آزادی کے پروانے تھے۔ لیکن اُن کے والد امیر حبیب اللہ خان انگریز کے وفادار دوست تھے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین پرانے خیالات کے علمبردار اور پیرو تھے۔ لیکن ان کے فرزند مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین پرانے خیالات کے علمبردار اور پیرو تھے۔ لیکن ان کے فرزند مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف مجاہد جلیل و کبیر تھے بلکہ کاروان آزادی کے میر کارواں" تھے۔ اسی طرح خود غازی کے والد قادیانیت کے پیرو اور انگریز کی غلامی کو رحمت سمجھنے والے ہیں۔ لیکن غازی کا احرار وطن کے خدام میں شمار ہے۔ جن کے متعلق اکثر حلقہ احباب میں سردار احرار مولانا حبیب الرحمان فرمایا کرتے تھے۔ "غازی احرار میں سب سے پیچھے آئے آگے بڑھ گئے۔ مثل عیسٰے آسمان پر چڑھ گئے"۔

"غازی" نے سردار احرار حضرت مولانا حبیب الرحمان کی رہنمائی و قیادت میں ۱۹۳۲ء سے ستمبر ۱۹۳۹ء دوسری جنگ کے آغاز تک کام کیا۔ اور اس عرصہ میں اس نے کئی مورچے احرار کے لئے سر کئے۔

پشاور کی آل انڈیا احرار کانفرنس کو کامیاب کرایا۔ جس کی کامیابی کے لئے سردار احرار اور مجلس احرار نے غازی کو خاص طور پر مرکز سے پشاور بھیجا تھا۔ اسطرح "غازی" نے نجاری کے دوسرے ۱۹۴۰ء کے تاریخی مقدمے میں حضرت مولانا مظہر علی اظہر کی قیادت میں کامیابی حاصل کی۔ اس مقدمے کی تاریخی گواہ لدھیانہ

غازی کے ہی اعتماد میں آخر دم تک رہے۔ غازیؔ کے ان سب کارناموں پر سردار احرار مولانا حبیب الرحمان ہمیشہ فخر اور ناز کا اظہار کیا کرتے تھے۔

سردار احرار مولانا حبیب الرحمان ایک نہایت پاکباز اور پابند صوم وصلوٰۃ متین و سنجیدہ بزرگ تھے۔ اور ان کے برعکس غازیؔ نہایت رنگین مزاج واقع ہوئے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی کسی اُلجھے ہوئے جماعتی مسئلے کو سلجھانے کے لئے چند گھنٹوں کے لئے باہم بیٹھ جانے کا موقعہ مل جایا کرتا تھا۔ لیکن مسلسل ان کی محفل میں غازی کو بیٹھنے کا کبھی شرف حاصل نہ تھا۔ تاہم سیاسی خیالات میں غازی ہمیشہ ہی سردار احرار مولانا حبیب الرحمان کے ہمفکر اور ہم خیال ہی رہے ہیں۔ ایک مرتبہ پٹیالہ میں احرار ورکروں کی کانفرنس کانگریس میں شمولیت کے مسئلے پر ہو رہی تھی۔ اس پر تمام احرار کارکن کانگریس کے خلاف اور اس سے قطع تعلق کرنے پر بضد تھے۔ لیکن سردار احرار مولانا حبیب الرحمٰن کا فرمانا تھا کہ احراری وہی ہو سکتا ہے۔ جو کانگرسی بھی ہو۔ اگر احراری کانگرسی نہیں تو پھر اس میں اور مسلم لیگی اور ایک فرقہ پرست میں باقی کیا فرق رہ جاتا ہے۔ اس کانفرنس میں سردار احرار مولانا حبیب الرحمان کے ہمنوا غازی کے علاوہ دوسرے بزرگ ملک نصراللہ خان عزیز آف ایڈیٹر مدینہ تھے۔ اور آخرکار تمام کانفرنس نے مولانا حبیب الرحمان اور اُن کے چند ساتھیوں کے دلائل کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ اور کانگرس میں شمولیت کا فیصلہ کیا گیا۔

سردار احرار مولانا حبیب الرحمان کی ایک خوبی تو معاصرین میں امتیازی شان رکھتی تھی۔ جس کے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اور تمام حریت پرست پارٹیوں کے رہنما قائل تھے۔ وہ یہ تھی۔ کہ خدا کی مخلوق کی خدمت کو وہ ہر حالت میں انجام دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جیل میں اپنے قیدی دوستوں کی خدمت میں مسرت محسوس کرتے تھے اور جیل سے باہر اپنے غریب نادار اور مخلص رضاکاروں کی خدمت کو اور سردار احرار کی خدمات اور خوبیوں کے بیان کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ اور غازیؔ کے لئے یہ ممکن نہیں۔ کہ وہ اس مختصر مکتوب میں انکی خدمات اور خوبیوں کو قلمبند کر سکے۔ کیونکہ ؎

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کیلئے

اور یہ چند سطور بھی وہ اس لئے سپردِ قلم کر رہے ہیں کہ وہ اپنے مرحوم رہنما کے ذکرِ حبیب کے ثوابِ ہستہ محروم نہ رہ جائیں۔ ورنہ غازیؔ ان تمام حالات کو کتابی صورت میں قلمبند کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خدا توفیق دے۔ آمین!

سردار احرار کے فرزند رشید مولانا عزیز الرحمٰن نے ضرور ایک کتاب "رئیس الاحرار" کے لئے شائع کی ہے لیکن وہ سردار احرار کی عوامی زندگی پر کما حقہ روشنی نہیں ڈالتی۔ ان کی عوامی خدمات اور عوامی زندگی پر ان کے کسی احراری دوست کا لکھنا زیادہ ضروری اور مناسب تھا۔ اور انشاء اللہ تعالٰے خدمت "غازیؔ" انجام دینے کی کوشش کرے گا۔ خدا سردار احرار مولانا حبیب الرحمان کی مغفرت کرے۔ اور اُن کے صدقے میں غازی جیسے گنہگاروں کی بھی خدا مغفرت کرے۔ آمین!

تاریخ وفات رئیس الاحرار

(از مولانا صوفی وارثی میرٹھی)

پیشوا احرار کے سب کے حبیب
پہلو میں دل بھی نڈر رکھتے تھے جو
سب کو تنہا چھوڑ کر وہ چل دیئے
جا کیا آباد باغ خلد کو
فکر ہے تاریخ رحلت کی اگر
"موت فخر ملک" اے صوفی کہو
١٣٧٦ھ

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کو ہم سے جدا ہوئے کچھ دن اوپر پانچ برس بیت چکے ہیں۔ ہر سال اس مدت میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ تا آنکہ صدیاں بیت جائیں گی۔ اور مولانا مرحوم کی لحد کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ مٹی کے نقش ونگار کے تمام گھروندے زمانہ کی بے اعتنائی اس طرح روند ڈالے گی گویا یہاں کبھی کسی کا مزار ہی نہیں تھا۔

لیکن دہلی کی سرزمین ہمیشہ گواہی دیتی رہے گی کہ میرے دامن پر سنہرا ایک ایسا انسان آرام کر رہا ہے جس نے انگریزی سامراج سے ٹکرا کر اپنا سر نہیں پھوڑا۔ بلکہ تاریخ عالم سے سلطنت برطانیہ کے نشان تک مٹا دیئے۔

جب وہ گرج کر برستے تو باطل کی صفوں میں انتشار پھیل جاتا۔ جب وہ احکام شرعیہ پر اپنا فیصلہ دیتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے عمر فاروق ہیں کہ دین سے انحراف کرنے والوں کو تنبیہہ کر رہے ہیں۔ ان کی پیشانی کی شکنوں سے برطانوی سامراج پر سینکڑوں شکن پڑ جاتے اور جب وہ مسکراتے تو سنت نبوی کی روشن تجلیں اور چمک اٹھتی۔

یہ تھے مولانا حبیب الرحمان، ان سے میری پہلی ملاقات سنہ ۱۹۲۱ء میں جالندھر کے ایک گاؤں نکودر میں ہوئی یہاں ان دنوں مدرسہ عربیہ کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ اس ملاقات کی تفصیل زیر طبع کتاب تاریخ امیر شریعت میں آئے گی۔

سیاسی اعتبار سے یہ وہ دن تھے پاک وہند کی آزادی کی جدوجہد کے دن تھے۔ انگریزی سامراج سے ٹکر لینے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہی ٹکر آگے چل کر نمکین ستیہ گرہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

مجلس احرار اسلام کا قیام

سنہ ۱۹۳۰ء کے آخر میں جب میں جیل سے واپس آیا۔ تو ملک کے حالات اور خاص کر ریاست کشمیر میں ڈوگرہ شاہی مظالم سے تنگ آئے ہوئے مسلمانوں کی چیخ وپکار سے پاک وہند کے مسلمان آپے سے باہر ہو رہے تھے اور غیر مسلم اخبارات کی بے ہنگم فرقہ پرستی نے حریت پسند طبقے کو اپنی جگہ سے ہلا دیا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان کا نیشنلسٹ ہندو کشمیر کی آزادی کے لئے مرنے والے عوام کو احترام کی نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہی حالات تھے کہ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء میں لاہور اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں مجلس احرار اسلام کا پہلا اجتماع ہوا۔

راقم الحروف خواجہ عبدالرحیم عاجز کی معیت میں اس تاریخی اجلاس میں شامل ہوا۔ یہ دوسرا واقعہ تھا کہ مولانا مرحوم سے میری ملاقات ہوئی۔ جو اس اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے۔ اس اجلاس کے اختتام پر وہ مجلس احرار اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔

ان کی صدارت میں مجلس احرار اسلام نے کشمیر کی آزادی کے لئے جو خدمات انجام دیں۔ تاریخ انہیں کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔

لاہور بورسٹل جیل

ریاستی حکام اور مجلس احرار اسلام کے درمیان لڑائی نے طول کھینچا تو ڈوگرہ شاہی اپنے انگریز آقاؤں کے در پر سربسجود ہوئی۔ چنانچہ فرنگی قانون اپنی سنگینوں سے لیس ہو کر احرار رضاکاروں کے سینوں پر چڑھ دوڑا۔ اور جب مسلمانوں کے سینوں نے انگریز سنگینوں کے منہ موڑ دیئے تو دونوں حکومتیں احرار رہنماؤں کے سامنے بے بس ہو گئیں۔ اور صلح کے لئے تمام احرار رہنماؤں کو پنجاب کی مختلف جیلوں سے بورسٹل جیل لاہور میں اکٹھا کیا گیا۔ ان میں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم، مولانا حبیب الرحمان مرحوم مولانا مظہر علی اظہر، شیخ حسام الدین۔ مولانا احمد علی مرحوم، مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ۔ ماسٹر محمد شفیع مرحوم قابل ذکر ہیں۔ باہر سے حکومت کے ایماء پر مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید رحمتہ اللہ علیہ صلح کی بات چیت کے لئے تشریف لائے۔ ایک ہفتہ وار کی مسلسل ملاقاتوں کے باوجود کشتی کنارے سے دور رہی۔ راقم چونکہ ورکنگ کمیٹی کا ممبر نہیں تھا۔ لہٰذا ان لوگوں سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ صلح کی گفتگو کی ناکامی کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن حکام جیل کی اجازت سے مجھے اپنے پاس لے آئے۔

ان دنوں کافی دیر تک مولانا مرحوم کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا۔ انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا بھی یہ سنہری موقعہ ملا جسے میں نے کسی طرح ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مولانا مرحوم جس طرح باہر سے اجلے تھے ان کا اندر بھی ویسے ہی صاف ستھرا تھا۔ وہ فرقہ پرست ہندومسلم کے بھی ویسے ہی دشمن تھے جتنا کہ انہیں انگریز سے بیر تھا۔ وہ اپنے رضاکاروں سے اسی قدر محبت کرتے جس طرح ایک جرنیل کو اپنی فوج سے ہونی چاہیئے۔ ان کی سادگی ان کے وقار کی طنابیں تھامے رہتی تھی۔ سماج کے مصنوعی رسم و رواج نے انہیں ہمیشہ اپنا دشمن قرار دیا۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ کسی نئے سورج کی روشنی انہیں راس نہ آئی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے۔

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

خیالات کے ہجوم سے اگر ان واقعات کا انتخاب کرنے بیٹھوں جن کے مجتمع کرنے سے تاریخ احرار اور داستان حبیب الرحمان مرتب ہو سکتی ہے تو مجھے ڈر ہے قانون مجھ سے بھی ناراض ہو جائے گا۔ اور مولانا مرحوم کی روح سے بھی زندگی کی طرح بگڑ جائے گا تاہم ان ایسے بہادروں کو خراج عقیدت پیش نہ کرنا ان کی وفاؤں سے مذاق کرنا ہے۔ جو ہمیشہ جفاؤں سے مذاق کرتے رہے ہیں۔

اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے غیر ملکی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور کھیر دار و رسن کو دعوت دی۔ جیل خانوں کو عمر بھر آباد کئے رکھا۔ فرنگی راُفلوں کی گولیاں دیوار بن کر ان بزرگان دین کے راستے میں حائل ہوئی۔ مگر ان محب وطن لوگوں کے قدم اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ان کی موت انہیں بعد آنے والی نسلوں کے لئے سنگ میل بن کر آج بھی راستہ دکھا رہی ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مؤرخ کا قلم زمانے کا دل اور اپنے پرائے قانون مولانا حبیب الرحمان ایسے ہزار دل محب وطن لوگوں کو قبول سکتے ہیں لیکن پروردگار اپنے بندوں کو جنہوں نے زندگی کی اپنے پروردگار کی اور حاجت روا جانا اپنے پالنہار کو۔ ان کی گردنیں صرف اسی کے سامنے جھکیں انہوں نے قانون مانا صرف اپنے رب کا۔ یقیناً قیامت کے دن بلند درجات کے مالک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اور ہم سب کے حال پر رحم فرمائے!

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

سید الاحرار

سید محمد سلیمان احمد سلیم برکتی علاء الدین پور

برادر عزیز القدر مفتی محمد احمد رحمانی سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔ آپ دونوں برادران عزیز کی مساعی جمیلہ پڑھ کر قلبی مسرت ہوتی ہے اور دعائیں نکلتی ہیں۔ الحبیب ایک معیاری پرچہ ہے - اس لئے اس کے حجم اور مضامین میں بھی وسعت کا خواہشمند ہوں ۔ حضرت سید الاحرار کے نام کا نمبر نکلے تو اس ناچیز فقیر یہ مرسلہ مضمون ضرور اس کی اشاعت خاصہ میں آنا چاہیے ممنون ہوں گا

بندۂ ناتواں سید محمد سلیمان احمد سلیم

دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

وگ جنہیں رئیس الاحرار کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں انہیں سید الاحرار کہا کرتا تھا ۔ مجھے فخر ہے کہ ان کی صحبت کیمیا اثر اور شفقت کے سایہ تلے دیر پا مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کی پُر خلوص رہنمائی میرے لئے ہر گام پر عنایت و سلامتی کا موجب ہوگی اور انشاء اللہ تعالیٰ تا زندگی یہی امید درخشاں ہے ۔ میں دلی مسرت اور فخر و وقار کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ ہر حال میں اُن کا خاص اعتماد حاصل تھا ۔ جو کسی دوسرے خوش نصیب کو شاید ہی حاصل ہوا ہو ۔ مولانا کی زندگی کا ہر گوشہ مجھ پر بے نقاب تھا میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا صرف سیاسی قائد اور مجاہد ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک بہت ہی عظیم المرتبت روحانی پیشوا بھی تھے دماغی لحاظ سے وہ اعلیٰ پایہ کے صاحب بصیرت سیاست داں تھے علمی لحاظ سے بے مثل صاحب انشاء اور جلیل القدر عالم تھے ۔ قلبی لحاظ سے وہ بہت ہی بلند مقام صوفی اور درویش کامل تھے ۔ ان کی ساری زندگی اور جدو جہد خدمتِ خلق اور رضائے الٰہی کے لئے تھی۔ ایک بار نزدیک سے جس کسی نے آپ کو دیکھ لیا ہمیشہ کے لئے آپ کا غلام بے دام ہو کر رہتا تھا ۔ آپ نے اپنی قربانیوں اور خدمات رجا یا کا صلہ کبھی بھی کسی حالت میں لینا پسند نہ کیا ۔ ہم نے بارہا دیکھا کہ صاحبان اقتدار اور مسند نشینان تخت و تاج نے حسنِ عقیدت سے مجبور ہو کر ان کی حق گوئی و بے باکی اور ملکی و ملی خدمات کے صلہ میں مسند ہائے اعزاز اور خلعت ہائے زرنگار پیش کیں۔ لیکن اس درویش کامل نے اُن کو ہمیشہ پائے استغنا سے ٹھکرا دیا ۔ علامہ اقبال مرحوم نے شاید آپ ہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ لکھا :-

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی
آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

آپ فرمایا کرتے تھے کہ میری ہر کارگزاری پروردگار عالم کی خوشنودی اور اس کی مخلوق کی خدمت کے لئے اس کی عبادت میں سے سب سے اعلیٰ عبادت خدمت خلق ہے

برطانوی سامراج کے سینہ پر سب سے بڑی چوٹ دوسری جنگ عظیم کے میدانوں میں پڑی۔ جس کے بعد برعظیم ہند و پاکستان سے اس کا کوچ ناگزیر ہوگیا تھا۔ اس چوٹ کا پلان مولانا کے ذہنِ رسا کا نتیجہ تھا۔ جو اُن کے دماغ سے نکل کر میرے سینہ میں آیا۔ اور میں نے اسے نیتا جی سبھاش چندر بوس کے دل و دماغ میں نقش کیا۔ جسے انہوں نے محاذِ جنگ میں پہنچکر پورا کیا۔ نیتا جی سبھاش بابو جب تک زندہ رہے۔ مولانا کا عاشقِ صادق بنکر رہے ۱۹۴۲ء میں اگرچہ مولانا دھرمسالہ جیل میں نظر بند تھے لیکن ان کے افکار کی لائن کو میں ری پبلکن سوشلسٹ آرمی کے ساتھ مل کر پورا کر رہا تھا۔

مولانا نے فرنگی سامراج کو اس برعظیم سے نکالنے کے لئے ہر طبقہ کے لوگوں سے حیرت انگیز اور عظیم ترین کام لئے۔ حتیٰ کہ کوئی مجذوب اور صوفی۔ کوئی درویش اور زاہد و عابد۔ ایسا نہیں۔ مولانا نے جس کے پاس پہنچکر ملک کی آزادی کی بھیک نہ مانگی ہو۔ اور ان کو اپنی کارگذاریوں کی کامیابی کے لئے دعاگو نہ بنایا ہو۔ میں ان میں سے اکثر کو جانتا ہوں۔ کچھ اُن میں سے آج بھی زندہ ہیں مولانا ہر شہر ہر قصبہ۔ ہر دیہات کے اہل قبور بزرگوں کے مزارات پر بیٹھ کر مراقبہ کے ذریعہ ان کی ارواح سے بھی ملک کی آزادی کے لئے دعاؤں کی بات کرتے تھے۔ بالآخر مولانا کی زندگی کا بہت ہی بڑا مشن ان کی نظروں کے سامنے ہی کامیاب ہوا۔ ملک آزاد ہونے کے بعد اُن کے سامنے امنِ عامہ اور انسانیت کی سلامتی اور ترقی کے ساتھ ساتھ مسلمان کو سچا مسلمان بنانے اور دعوتِ اسلام کو عام کرنے کا مشن تھا۔

تقسیم ملک کے بعد مولانا بہاولپور میں تھے۔ میں اُن سے ملنے کے لئے گیا تو فرمانے لگے۔ شاہ جی! خواجہ معین الدین رح کون تھے؟ اور ان کے کون سے ایسے کارنامے تھے۔ جن کے باعث وہ سلطان الہند مشہور ہوئے؟ میں اس سوال کا مطلب بھانپ گیا۔ عرض کیا۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو کارنامہ اس ملک میں آکر ادا کیا۔ اگر ہم اور آپ اس کو دوہرا نہیں سکتے تو پھر مسلمان کہلانا فضول ہے۔ چلو چشتی رح نے جس سرزمین پر پیغام حق سنایا۔ اور ذات پات کو چھوڑا اور چھوت چھات کو توڑا۔ اور انسانیت کو اُجاگر کر کے اسلام کا نام روشن کیا۔ ہم بھی ان کے مشن امن و سلامتی کو آج کے ہند میں روشن کریں۔ میں اس دعوت پر سرجھکا رہ گیا۔ اور مولانا سرزمینِ دعوتِ سلطان الہند میں چلے گئے۔
میں سمجھا کہ

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا کی منظورِ عجائب پر غرائب شخصیت نے سچ مچ حضرت خواجہ اجمیری رح کی راہ پر سعادت اختیار کر کے دکھادی۔ جس کا ایک مظہر آج انجمن اسلامیہ پنجاب و ہند ہے۔

ادھر حضرت سید الاحرار اس عالم ناپائیدار سے عالم بقا کی جانب تیاریوں میں مشغول تھے۔ اُدھر میں قلب و دماغ کے اضطراب میں بے چین تھا۔ اور اپنے ارادتمندوں کے دیہاتی دورہ میں سفر پر تھا۔ تحصیل جڑانوالہ کے ایک دیہات میں مولانا کی آخری شب کے آخری حصہ میں محوِ خواب تھا کہ حضرت موچپورہ ناچی کے میدان میں ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کے بعد اپنے گھر شفاعت منزل کو آ رہے تھے۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سے نئے اور پرانے احباب ساتھ تھے۔ میں بہت عرصہ کے بعد شفاعت منزل کی جانب جا رہا تھا۔ شفاعت منزل کے احاطہ میں ہم داخل ہوئے تو اس میں ایک خوبصورت باغیچہ کے اندر ایک مختصر سا خوبصورت بنگلہ جو بالکل نیا تھا نظر آیا۔ مولانا کھٹ سے اس بنگلہ کے ایک کمرہ میں داخل ہو کر آرام فرما ہونے لگے۔ اور مجھے فرمایا۔ شاہ جی! باجی (حضرت مولانا کی اہلیہ صاحبہ) سے کہا کہ میں حضرت

کا ارشاد پاکر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں ۔شفاعت منزل کے ساتھ ایک اور چہار منزلہ وسیع مگر پرانی عمارت بھی کھڑی ہے ۔ اور اس کے اردگرد ایک وسیع باغ ہے ۔ میں اس کی دوسری میں داخل ہوا تو مرحومہ بی بی صاحبہ درویشانہ کھدر کے لباس میں ملبوس ذکر اللہ میں مصروف ہیں ۔ میں نے بصد آداب و نیاز سلام کیا ۔ انہوں نے دعائیں دیں اور میرے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے بڑے جذبے کے ساتھ فرمایا ۔ شاہ جی دیکھو ۔ تمہارے مولانا صاحب وہاں رہتے ہیں ۔ یہاں نہیں آتے ۔ بات ختم ہوتے ہی اس عمارت کی دو منزلیں بڑے زور اور گرج سے نیچے گریں ۔ اور خوف سے میری آنکھ کھل گئی ۔ اس کے بعد بھی میں پانچ روز تک سفر میں رہا ۔ لیکن دل کی دنیا میں ایک سخت کرب و اضطراب تھا ۔ آخر میں دیہات سے نکل کر لائلپور آیا ۔ تو وہاں ایک دوست نے

درویش کامل مجاہد جلیل سید الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پُر ملال کی خبر سنائی ۔ اپنے اضطراب بے پایاں کی ساری وجہ سمجھ میں آ گئی ۔

مجھے اپنے عزیز القدر برادر جنرل سیکرٹری انجمن اسلامیہ پنجاب مولانا محمد احمد رحمانی کی جوان ہمتی اور سعادت مندانہ طبیعت سے امید ہے کہ مولانا کے انتقال سے اُن کے عظیم مشن کی جو منزلیں گر گئی تھیں وہ اُنہیں پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیں گے ۔ "ہمت مرداں مددِ خدا" کے مصداق قدرت میرے اس بھائی اور عزیز کی جرأت انگیز مدد کرے گی ۔ ہمت و استقامت کی دولت بے پایاں مولا کریم اس عزیز کے سرکاب فرمائے ۔

اپنی حالت تو اس شعر کے مصداق بن کر رہ گئی ہے ؎

نہ وہ دُنیا ہے نہ دل ہے ، نہ وہ بادہ ہے نہ ساقی
فقط اک درد ہے زندہ فقط اک یاد ہے باقی

قطعہ تاریخ بصنعت ضرب و جمع

بروفات حسرت سمات رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی

نور اللہ مرقدہ

حضرت مرحوم نے دُنیا کو پایا بے وفا	چل دیئے خالق سے ملنے کے لئے وہ باکمال
تھے وہ بطلِ حریت اور قوم پر قربان تھے	تھے سلف کی طرح وہ بھی ایک فرد بے مثال

سال چاہو چار کا ماتم کرو تم چار سُو

محرم دانا　مرنجان　نیک دل　گردوں جلال

٣٤٤　٣٤٤　٣٤٤　٣٤٤

نوٹ :- مصرع تاریخ کے چاروں لفظوں کے اعداد جمع کریں تو مرحوم کا سال وفات برآمد ہوتا ہے اور چونکہ ہر لفظ کے اعداد مساوی ہیں ۔ لہٰذا ہر ایک کو ۴ پر ضرب دیں ۔ تو بھی یہی سال برآمد ہوتا ہے ۔

ایک مصرع اور پانچ تاریخیں مرحوم کا روحانی تصرف نہیں تو اور کیا ہے ؟

دیگر :-

آفتاب حریت وائے قسمت شد غروب	ہر کہ و مہ از غمش مبتلائے آہ گشت
فکر کردم سال دار د سروش آمد ندا	سال رحلت ارتحال خلیل اللہ گشت

نوٹ :- یہ قطعہ بحر مدید میں ہے جس کا وزن فاعلاتن فاعلن چار بار ہے ۔ عروض و ضرب بتیں بروزن فاعلان ہیں ۔ ارتحال کے لام کی زیر کو ذرا کھینچ کر پڑھیں ، تو بحر سالم مع زحاف رہیگی ورنہ مزحف مخبول بوزن فعلاتن شمار ہوگی ۔ (از محمد ادریس نسیم د...)

مولانا حبیب الرحمان کی وفات سے ملک کا نقصان نہیں ہوا بلکہ میرا ذاتی نقصان بھی ہوا ہے۔
(جواہر لال نہرو)

جنگِ آزادی کے دو عظیم رہنما

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان صاحب لدھیانوی کی دو باتیں

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی

برادر عزیز مولوی محمد احمد رحمانی صاحب!

سلام مسنون۔ اس وقت سفر میں ہوں۔ کلکتہ جا رہا ہوں۔ آپ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ یہ چند سطریں حاضر ہیں چاہیں تو ان کو "الحبیب" میں شائع فرما دیں۔ عدیم الفرصتی اور وقت مناسبت کی وجہ سے بالکل معذور ہوں۔

نیاز مند:۔ نعمانی

دسمبر ۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد مرحوم کے زیر صدارت مسلمانانِ ہند کی ایک عظیم الشان کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ یہ تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے خونی ہنگاموں کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی پہلی بڑی کانفرنس تھی۔ اور اپنے موضوع و مقصد کے لحاظ سے بھی بہت اہم تھی۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب جو اب مرکزی کابینہ کے رکن ہیں۔ اور اس وقت ہماری ریاست اتر پردیش کے وزیر تھے۔ وہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کے صدر تھے۔ مولانا حفظ الرحمان اور حضرت مولانا مدنی رحمتہ اللہ علیہ اس کے خاص داعیوں میں تھے۔ آپ کے والد ماجد (مولانا حبیب الرحمان صاحب لدھیانوی مرحوم) اور آپ کے سب گھر والے مشرقی پنجاب کے ناکھول مسلمانوں کے ساتھ پاکستان دھکیل دیئے گئے تھے۔ اس لئے اس کانفرنس میں مولانا مرحوم کی شرکت کی کوئی توقع ہی ہم لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ کانفرنس کے دفتر سے رابطہ کے باوجود میں نے یہ سنا بھی نہیں تھا۔ کہ مولانا کو بلانے کی بھی کوئی کوشش کی گئی ہے۔ کانفرنس شروع ہو چکی تھی۔ اور ایک کام اور پروگرام کے تحت ہم چند دوستوں نے کانفرنس کے قریب ہی ایک جگہ ڈیرا ڈال لیا تھا۔ اور پورا وقت ہمارا وہیں گزرتا تھا۔ غالباً کانفرنس کا پہلا ہی دن تھا۔ میں کسی ضرورت سے ظہر کے وقت مکان پر آیا۔ اس زمانہ میں میری رہائش احاطہ سلیمان قدر میں تھی۔ جب میں کانفرنس کی طرف جانے کے لئے اپنے مکان سے چل کر بڑھانے والی سڑک پر آیا۔ (جو لکھنؤ کے اسٹیشن چہار باغ سے رکاب گنج ہوتی ہوئی گول دروازہ اور اس کیتی باغ تک چلی جاتی ہے جہاں کانفرنس ہو رہی تھی) تو میں نے سنا۔ کہ کوئی میرا نام لیکر زور زور سے آوازیں دے رہا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک تانگہ میں ہمارے مولانا مرحوم آ رہے تھے۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور سوچنے لگا۔

ایں کہ مے بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب

میں شوق میں بے تابانہ تانگہ کی طرف بڑھا۔ مولانا نے تانگہ رکوایا۔ اور اتر کے پہلے بغلگیر ہوئے۔ اللہ نے ان کو بڑا مضبوط دل دیا تھا۔ مگر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں بھی ساتھ ہی تانگہ میں سوار ہو گیا۔ مولانا نے بتایا۔ کہ مولانا حفظ الرحمان صاحب نے دو تین تار دیئے تھے۔ کسی طرح آ گیا ہوں۔ ہوائی جہاز سے میں کل دہلی پہنچ گیا تھا۔ بہت کوشش کی۔ کہ اس وقت لکھنؤ کے لئے ہوائی جہاز مل جائے۔ لیکن انتظام نہ ہو سکا۔ مجبوراً ٹرین سے آنا پڑا۔ اور اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔ اس سلسلہ گفتگو میں فرمایا۔

بھی مولوی منظور صاحب ! ہندوستان و پاکستان میں ان دنوں میں جو کچھ ہوا۔ اس سے مجھے ذرہ بس یہ ملا ہے کہ شرک کی ساری راتیں کٹ گئیں۔ اور الحمد اللہ اب دل کے کسی گوشہ میں ــــ کسی سے کوئی امید وار کوئی اندیشہ نہیں رہا ہے سب کو دیکھ لیا۔ پھر جب کانفرنس میں تقریر فرمائی۔ تو اگرچہ اس کا موضوع دوسرا تھا لیکن اس میں بھی یہ بات بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمائی۔

سنہ ۲۸-۱۹۴۹ء میں ایک دفعہ لکھنؤ تشریف لائے۔ ہندوستان کے سیاسی حالات اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ کانگریس اگر مسلمانوں کو نہیں اپنائے گی۔ اور ان کا خوشدلانہ تعاون حاصل نہیں کرے گی تو ہندو فرقہ پرست طاقتیں اسکو فنا کر دینگی۔ اب اس صرف مسلمانوں کو اپنا کر بچ سکتی ہے۔ اس کے لئے صرف یہی راہ ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے لئے صرف یہ راستہ ہے کہ وہ کانگرس کو اپنائیں اور اس کے نظام میں داخل ہوں۔

امام المجاہدین

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری
مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان

بخدمت گرامی عزیزم مولوی محمد احمد رحمانی صاحب دام مجدھم

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔ عزیزم اب کیا ہو سکتا ہے جب چڑیاں چگ گیئں کھیت۔ فالج کا بیمار ہوں۔ نہ ہاتھ میں لکھنے کی طاقت۔ نہ زبان میں بولنے کی قوت نہ دماغ میں سوچنے کی استطاعت۔ اگر لکھا جائے تو کیا لکھا جائے۔ تاہم تعمیل ارشاد کے لئے ایک دو واقعہ مختصراً ذکر کرتا ہوں۔ والسلام

خیر محمد مہتمم خیر المدارس ملتان ۔ ۱۵ ایریل

۱۔ برادر معظم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ بچپن میں ہم نے تعلیم ابتدائی مدرسہ رشیدیہ نکودر میں مولانا مولوی عبداللہ صاحب گنگوہی سے اکٹھے پائی ہے۔ فارسی گلستان تک اور میزان الصرف وہاں پڑھی ہے۔

۲۔ مرحوم میں ایک وصف تھا جو کہ میں نے دیکھی ۔ وفاداری یعنی جہاں کہیں رہا۔ رائپور گوجراں۔ گنگا ڈھٹی۔ بریلی۔ طالب علمی کے زمانہ میں برابر خط بھیجتے۔ اور کبھی کوئی چیز بھیجتے رہے۔ اور جب مدرس ہوا۔ منشی صادق گنج میں کئی مرتبہ ملاقات کے لئے آئے۔ بلکہ دو مرتبہ مولانا محمد زکریا صاحب ان کے والد صاحب مرحوم آئے۔ جب جالندھر آ گیا تو پھر تو بے شمار مرتبہ آنا پڑا۔ اور مدرسہ میں قیام کیا۔ جب سے سیاسیات میں قدم رکھا تو کئی مسائل میں اختلاف کی نوبت آئی۔ مگر دوستی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ وہی آنا جانا۔ اسی طرح سے ہنسی مذاق۔ اب کہاں سے ایسے وفادار کو ڈھونڈیں۔

۳۔ رئیس الاحرار مولانا مولوی حبیب الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ سیاسیات میں سب کے مرجع تھے۔ امام المجاہدین۔ بطل حری۔ صائب الرائے تھے۔ حتٰی کہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری مرحوم ان کی رائے کا اتباع کرتے تھے۔

۴۔ جس زمانہ میں جلسہ قادیان تھا جس میں شاہ صاحب بخاری رحمتہ اللہ علیہ صدر تھے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے مولانا مرحوم دہلی تھے۔ دہلی سے تھانہ بھون خط جوابی لکھا۔ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ العزیز کی خدمت میں کہ میں تھانہ بھون آنا چاہتا ہوں بشرطیکہ مجھے اجازت ہو۔ مسجد خانقاہ امدادیہ میں تقریر کرنے کی۔ اور آپ بھی سنیں۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ

باقی صفحہ ۲۵ پر

قِفَا نَبْکِ مِنْ ذِکْرَیٰ حَبِیْبٍ وَّ مَنْزِلٖ
بِسِقْطِ اللِّوَیٰ بَیْنَ الدَّخُوْلِ فَحَوْمَلٖ

یوں تو میں حضرت مولینا مرحوم کو اپنی طالب علمی کے زمانہ سے جانتا تھا۔ اور کون پڑھا لکھا مسلمان ایسا ہے جس نے اِس نیستاں حریت کی گرج نہ سُنی ہو۔ مگر حضرت مولینا سے تعلقات کی نوعیت ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہوئی۔

لاوڑ ضلع میرٹھ کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ وہاں کسی مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولینا وہاں تقریر کے لئے مدعو تھے۔ میں بھی جلسہ کی شرکت کے لئے گیا ہوا تھا صبح کی چائے کا انتظام وہاں کے ایک بڑے مسلمان تاجر کے مکان پر تھا۔ اتفاق سے مجھے مولینا کے بہت قریب نشست ملی۔ مولینا نے مجھ سے میرا نام اور وطن پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔ مولانا نے سنجیدگی کے ساتھ فرمایا: "آپ کھڑے ہو جایئے"!

میں ڈرا کہ کہیں مجھ سے بے ادبی تو نہیں ہو گئی ہے کہ میں مولانا کے اتنے قریب آ بیٹھا ہوں۔ مگر جب دیکھا کہ مولانا اپنا عربی عبا سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے حسین چہرہ پر تبسم کی بجلیاں چمک رہی ہیں تو جان میں جان آ گئی اور کھڑا ہو گیا۔ حضرت مولانا نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ فرمایا اور پھر فرمانے لگے "تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ میں نے تمہاری "خلافت راشدہ" اور "خلافت بنی اُمیّہ" کا مطالعہ جیل میں کیا تھا"۔ پھر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اور جب میں رخصت ہونے لگا تو وعدہ لے لیا کہ ان کے دولت کدہ پر دہلی آ کر ملوں۔ بلکہ وہیں قیام کروں۔

میرا دہلی آنا جانا "الحرم" اور اس کے مکتبہ کی کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں رہتا ہی تھا۔ مولانا سے برابر ملاقات ہونے لگی۔ بلکہ مولانا کا دولت کدہ ہماری مُستقل قیام گاہ بن گیا۔

مہمان نوازی

دہلی میں "مہمانی" کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ دہلی والے بڑے خشک ہوتے ہیں۔ مہمانوں سے گھبراتے ہیں۔ مگر مہمان داری کی بات یہ ہے کہ وہ بیچارے کتنے معذور ہیں۔ اوّل تو دہلی کے مکان عام طور پر (اُردو ساخت قطع نظر) مختصر ہی ہوتے ہیں۔ پھر دہلی میں آنے والے مختلف اغراض سے بہ کثرت آتے ہیں۔ آخر کس کس کی مہمانداری کریں؟

مگر مولانا کا مردانہ مکان ماشاء اللہ بڑا وسیع اور آرام دہ تھا۔ اور جتنا ان کا مکان وسیع تھا۔ اس سے زیادہ اُن کا قلب وسیع تھا۔ ان کے ہاں مہمانوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ بعض لوگ رات کے ایک اور دو بجے آن دراناہ ہوتے تھے۔ مگر میں نے کبھی ان کی پیشانی پر شکن پڑتے نہیں دیکھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مہمان کو دیکھ کر اُن کا چہرہ چمک اُٹھتا تھا۔ اگر کوئی دوست آ جاتا تو پھر تو پھولے نہ سماتے۔ کھڑے ہو کر مصافحہ کرتے اور اپنے برابر میں مسند پر جگہ دیتے۔

کھانے پینے کے معاملہ میں ان کے ہاں تکلف کو دخل نہ تھا جو کچھ گھر میں موجود ہوتا۔ سامنے رکھ دیتے۔ گھر میں کھانا ختم ہو چکا ہوتا تو بازار سے منگا لیتے۔ اگر مہمان کھانے سے انکار کرتا تو اس انکار کو واقعیت پر محمول کر کے اصرار بھی نہ کرتے۔

اس بے تکلفی پر مولینا کی سنجابیت کو بھی دخل تھا۔ ہم یوپی

والے تکلف کے عادی۔ مہمان بھی تکلف کرے گا اور بھوکا ہوتے ہوئے بھی کہے گا کہ کھا کر آیا ہوں اور میزبان بھی اصرار کرے گا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کھاؤ۔ خواہ بے چارہ مہمان کھا کر ہی آیا ہو۔

میں نے مولانا کے ہاں جب ابتدا میں قیام کیا تو حسب عادت تکلف برتا۔ ایک دن کھانا کھا کر ... چلا تھا مگر مولینا کے استفسار پر کہہ دیا کہ بھوک نہیں ہے۔ خیال یہ تھا کہ مولانا اصرار فرمائیں گے۔ مگر وہ خاموش ہو گئے مجھے اس رات بھوکا ہی رہنا پڑا۔ پھر میں نے کبھی ایسی غلطی نہ کی۔ بھوک ہوتی تو صاف کہہ دیتا کہ کھانا منگوا لیجئے۔

مولانا کے ہاں کھانے کی نوعیت میں بھی تکلف نہ ہوتا تھا۔ ایک روز ان کے ہاں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر مسٹر ڈھیبر کی دعوت تھی۔ میں بھی اس میں شریک کیا گیا۔ کھانے پر دو یا تین قسم کی ترکاریاں تھیں اور گرم گرم روٹی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتا ہوں۔ اس دن دسترخوان پر مولینا نے مسٹر ڈھیبر سے سیاسیات حاضرہ پر ایسی عمدہ گفتگو کی۔ کہ وہ مولانا سے بیحد متاثر ہوئے۔ اور دوران گفتگو میں کہا کہ "آپ جیسے آدمی کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں ضرور ہونا چاہیئے"۔ مگر مولانا جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور مسٹر ڈھیبر اس خیال کو عمل میں نہ لا سکے

ذہانت و فطانت

مولانا بے حد ذہین تھے۔ مخاطب کے چہرہ پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کے صفحۂ دل کی تحریر پڑھ لیتے تھے۔ گفتگو بڑی تلی ہوئی اور مدلل کرتے تھے۔ مختصر لفظوں میں اپنا مضمون سننے والے کے دل میں پیوست کر دیتے تھے۔

۱۹۵۵ء میں مولانا نے جو سفر حج کیا۔ اس میں مولانا کی عالم اسلام کی ممتاز علمی و سیاسی شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مولانا کی گفتگو سے سب کو میں نے متاثر دیکھا۔ ان کے دلائل کے سامنے سب پراگندہ نظر آتے تھے۔ جہاں گفتگو سے کام نہ چلتا۔ وہاں ٹیکٹ سے کام نکالتے تھے۔ حج سے فراغت کے بعد جدہ کو واپسی ہوئی۔ تو پروانہ راہداری میں کوئی قانونی نقص رہ گیا تھا۔ جب تمام سامان لاد کر مکہ معظمہ سے باہر نکل آئے۔ تو راستہ میں پولیس چوکی پر کار روک لی گئی مولوی محمد احمد کاظمی صاحب ایم۔ پی نے جو رفیق سفر تھے۔ نے بہت کچھ کہا سنا۔ مگر پولیس افسر نہ مانا۔ اور واپس لوٹنے پر اصرار کیا۔ آخر مولانا اترے۔ پولیس افسر کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈالا۔ دو تین لفظ معذرت کے کہے اور معاملہ ختم کر دیا۔

عربوں کی دولتمندی کا خطرہ

عرب کے دوسرے علاقوں کی طرح سعودی عرب میں بھی تیل کے چشموں کے انکشاف نے جو زر و سیم کے دریا بہا دیئے ہیں۔ عرب حکومتیں ان پر کتنا ہی فخر کریں۔ مگر اہل نظر اس پر فکرمند ہیں۔ یہ تیل کی کمپنیاں نہیں ہیں بلکہ مغربی استعمار کے قلعے ہیں جو جزائر عرب میں ہر جگہ قائم کر دیئے گئے ہیں "آرامکو" نے سعودی عرب کے سینکڑوں میل کے علاقہ کو فیکٹریوں اور دفتروں کے نام سے اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے صرف غوار کی فیکٹری سوا سو میل کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے اس تیل کو مغربی ملکوں میں پہنچانے کے لئے ایک طویل پائپ لائن دمام سے لبنان کی بندرگاہ صیدا تک بچھی ہے جو ایک برٹش کمپنی کی ملکیت ہے۔ ان کمپنیوں میں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل اقتدار ملک میں ان کمپنیوں کا ہے۔ کویت کے معاملہ پر یہ حقیقت حال ہی میں واضح ہو کر سامنے آ چکی ہے۔ مغربی پنجہ استعمار میں گرفتار ہونے کے علاوہ دولت کی اس ریل پیل نے باشندگان عرب کو عیاش اور آرام طلب بنا دیا ہے۔ بہتر سے بہتر سامان تعیش جہازوں میں لدا ہوا مغربی ملکوں سے چلا آ رہا ہے۔ بمبئی اور دہلی کے بازاروں میں آپ کو جو سامان نہ ملے گا۔ وہ جدہ اور مکہ معظمہ کے بازاروں میں مل جائے گا جب بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ راحت و فراغت میسر آ جائے۔ تو کوئی ملک میں کارخانے قائم کرنے اور سامان تیار کرنے کی مصیبت کون مول لے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اندرون ملک کوئی صنعت موجود

نہیں نشہ عشرت کی اس مدہوشی کو عام دوام بنانے کیلئے ناولوں اور افسانوں اور دوسرے فحش لٹریچر کی اشاعت سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جدہ میں ان کے کئی مراکز قائم ہیں۔ ایک ادیب و صحافی جدہ میں ہم لوگوں سے ملنے کیلئے تشریف لائے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات کا ایک سیٹ اس خاکسار کو بھی عطا کیا۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد جب کتابیں دیکھیں تو ان میں ان کے لکھے ہوئے مختصر افسانوں کا مجموعہ بھی تھا جس میں جا بجا نیم برہنہ تصویریں موجود تھیں۔ (یہ مجموعہ میرے پاس پڑا ہوا ہے) بے اختیار یہ مصرعہ زبان پر آگیا۔ ؎ "چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!"

مولانا جیسا بالغ نظر سیاست دان اور مغربی استعمار کی مشنری کے کل پرزوں کا ماہر انجینیئر اس صورت حالات سے جس قدر دلگیر ہوتا کم تھا۔

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ کے قیام کے دوران۔ بلاد عربیہ کے بہت سے سیاست دان۔ اخبار نویس اور علماء مولانا سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے رہے۔ مولانا بھی ان لوگوں سے ملاقات کے لئے تشریف لے جاتے۔ مولانا بڑی دردمندی اور بے قراری کے ساتھ عرب ملکوں کے موجودہ حالات کے خطرناک نتائج سے آگاہ فرماتے۔ مغربی ملکوں کے استعماری داؤ پیچ کو بے نقاب کرتے اور تین امور کی طرف ان کی توجہ خصوصیت کے ساتھ منعطف کراتے۔

(۱) اتحاد ممالک عربیہ (۲) ملک میں صنعتی اداروں کا قیام۔ اور مغربی مصنوعات سے احتراز (۳) جدید و قدیم علوم کے تعلیمی اداروں کا اجراء

اتحاد عرب کی دعوت

ایک روز دمشق کے ممتاز عالم شیخ احمد کفتارو نقشبندی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ گفتگو عرب ممالک کی سیاست پر ہونے لگی۔ مولانا نے فرمایا۔ اگر آپ بلاد عربیہ کو مغربی استعمار کے جال کے پھندوں سے نجات دلا سکیں اور چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کا جنہیں برطانیہ، امریکہ اور فرانس نے اپنی مصلحتوں سے تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک عرب فیڈریشن بنا سکیں تو یہ اسلام کی بڑی خدمت ہوگی۔ اسلام دنیا کے لئے آزادی کا پیغام لایا۔ یہ کیسی بد قسمتی ہے کہ وہ ملک جہاں سب سے پہلے اسلام کا نور پھیلا۔ برطانوی اور امریکی اقتدار کے سایہ میں ہیں۔

شیخ نے بڑی توجہ سے مولانا کی باتوں کو سنا۔ پھر فرمانے لگے۔ ہونا تو یہی چاہیئے جو آپ فرما رہے ہیں۔ مگر عملاً اس میں بڑی مشکلات ہیں۔ عرب ریاستوں میں اسلام پر وطنیت غالب ہو چکی ہے۔ اور اس جذبہ نے شامی عراقی اور حجازی کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔

مولانا نے فرمایا ہندوستان کے مختلف صوبوں کے باشندے رنگ روپ میں، زبان میں۔ تمدن و معاشرت میں اور مذہب میں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ مگر آزاد ہندوستان میں سب ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان میں چار سو ریاستیں تھیں مگر ان سب کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ انگریز نے اپنے مقاصد کے لئے ان کے درمیان جو حدیں قائم کر دی تھیں۔ ان کو توڑ ڈالا گیا ہے۔ اور اب یہ سب ایک گھرانا بن گئے ہیں۔ آپ کا ملک تو درحقیقت ایک ہے۔ تمدن و معاشرت ایک ہے۔ زبان ایک ہے۔ مذہب ایک ہے۔ پھر آپ کی سیاست ایک کیوں نہیں ہو سکتی؟

شیخ خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔

کارخانے کھولو

مدینہ منورہ کے دوران قیام میں ایک روز وہاں کے مشہور اخبار "المدینۃ المنورۃ" کے مدیران محترم نے مولانا اور ان کے رفقاء کی دعوت کی۔ میز پر مشروب کی حیثیت سے وہی "کوکا کولا" رکھا گیا۔ جو حجاز کا مقبول عام اور دلپسند شربت ہے مولینا نے فرمایا۔ افسوس آپ ہمیں شربت بھی مغربی ملکوں سے آیا ہوا پلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو روحانی برکتوں کے ساتھ ساتھ کھجور جیسی لذیذ مادی نعمت سے نوازا ہے ہمارے ہاں ایسی گڑوں میں وہ شیرینی اور لطافت نہیں ہوتی

جو مدینہ منورہ کی کھجوروں میں ہے۔ کیا آپ کا خیال کبھی اس طرف منعطف نہیں ہوا کہ آپ کھجوروں کا شربت تیار کریں یہ آپ کے ملک کی ایک بہترین صنعت ہو سکتی ہے۔ پھر مولانا نے فرمایا۔ آپ کے ملک میں آنے والے حاجی ہر سال لاکھوں رومال اور جانمازیں یہاں سے خرید کر لے جاتے ہیں۔ یہ سب اٹلی کی تیار شدہ ہوتی ہیں۔ بلکہ تسبیحیں تک اٹلی سے آتی ہیں۔ کیا سعودی حکومت یہاں جانمازوں اور رومالوں کے بنانے کے کارخانے نہیں کھول سکتی۔ اگر ایسے کارخانے ملک میں کھل جائیں تو ایک طرف حاجیوں کو اصلی تبرک مل سکے اور دوسری طرف ان ہزاروں گداگروں کے لئے روزگار مہیا ہو سکے جو خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے دروازوں پر پڑے جانے کھڑے رہتے ہیں۔

مدیران محترم مولانا کی اس تقریر سے بید متاثر ہوئے اور اخبار کی اگلی اشاعت میں مولانا کی اس تجویز پر ایک پر زور اداریہ لکھا۔

مدینہ یونیورسٹی

مدینہ یونیورسٹی کا آج کل بہت چرچا ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے سفر حجاز میں یہ تجویز بھی وہاں کے بعض عمائد کے سامنے رکھی تھی۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں مجلہ "الحج" کے مدیر اعلیٰ شیخ محمد سعید العامودی جب ملاقات کے لئے تشریف لائے تو مولانا نے مفصل طور پر ان سے اس موضوع پر گفتگو کی اور ایک ایسی مرکزی دینی درسگاہ کے قیام پر زور دیا جہاں تمام بلاد اسلامیہ کے طلبہ اپنے اپنے فقہی مسلک کے مطابق علوم دینیہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ مدیر موصوف نے مولانا سے فرمایا کہ وہ اپنی تجویز کو تحریری صورت میں حکومت کے سامنے پیش کریں۔ مجھے یاد نہیں کہ مولانا نے حکومت سعودیہ کو اس سلسلہ میں مخاطب کیا یا نہیں۔

موجودہ "مدینہ یونیورسٹی" کہاں تک مذکورہ بالا مقصد کو پورا کر سکتی ہے۔ اس پر گفتگو کرنے کے لئے انتظار کی ضرورت ہے۔

رو قادیانیت

ان مباحثہ کے علاوہ دو اور موضوع تھے۔ جن پر مولانا اکثر تبادلہ خیالات فرمایا کرتے تھے۔ ایک "رد قادیانیت" اور دوسرا دیوبند کی تعلیمی تحریک۔

قادیانیت کو مولانا دینی نہیں قطعاً ایک سیاسی تحریک سمجھتے تھے۔ مولانا کی رائے تھی۔ کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں میں انگریزوں کی مخالفت اور ان سے نفرت کا جولاوا اُبلتا رہا۔ اور جو کبھی تحریک سید شہیدؒ اور کبھی انقلاب ۱۸۵۷ء اور کبھی انبالہ کیس کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس کو سرد کرنے کی بہترین صورت یہ تھی۔ کہ قادیانی نبی کو مسلمانوں کا پیشوا بنا دیا جائے۔ جس نے جہاد کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اور انگریزی حکومت کی تائید میں پچاس الماری کتابیں تصنیف کی تھیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ مسلمانان ہند کی توجہات بلاد عربیہ کی طرف سے ہٹ جاتی تھیں۔ اور حرمین اور بیت المقدس کی بجائے ان کی عقیدتوں کا مرکز "قادیان" بن جاتا تھا۔

اصل میں مولانا کے جد بزرگوار مولانا مفتی شاہ محمد صاحب لدھیانوی کی یہ دینی و سیاسی بصیرت تھی۔ جو مولانا کو وراثت میں ملی تھی۔ حضرت مولانا مفتی شاہ محمد صاحبؒ نے جس طرح تمام علماء ہند سے پہلے ۱۸۸۸ء میں مسلمانوں کو شرکت کانگرس کا فتویٰ دیا تھا۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی کے مرتد اور انگریز کے ایجنٹ ہونے کا بھی فتویٰ دیا تھا۔

پھر حضرت الاستاد علامہ مولینا سید انور شاہ کشمیریؒ کی صحبت میں مولانا کی اس خاندانی بصیرت میں مزید چمک پیدا ہوئی۔ آخر "تحریک کشمیر" میں مولانا نے قادیانیت سے جماعتی حیثیت سے ٹکر لی۔ اور کشمیر کو قادیانیت کی آغوش میں جانے سے بچا لیا۔

مادر علمی کی محبّت

جہاں تک دیوبند کا تعلق ہے۔ دیوبند مولانا کا علمی گہوارہ تھا۔ مولانا نے جو کچھ حاصل کیا۔ وہیں سے حاصل کیا۔ علاوہ اپنی سعادتمندی۔ نیک طبعی۔ ذکاوت و فطانت اور طلاقت

لسانی کی وجہ سے بہت جلد اس وقت کے اکابر دیوبند کے منظورِ نظر بن گئے تھے۔ انہیں مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان رح اور مولانا میاں اصغر حسین جیسے مرشدین کامل، حضرت مولانا محمود احمد رح اور حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی رح جیسے اصحاب تدبیر و سیاست، علامہ حضرت مولینا انور شاہ کشمیری جیسے صاحب علم و فضل اور حضرت مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی جیسے متکلم و خطیب بزرگ علمی و عملی رہنمائی کے لئے مل گئے تھے۔ مولینا نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اور انہوں نے بھی ان کو سینہ سے لگایا۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ مولانا کو طبعاً مدرسہ کی خاموش فضا کے مقابلہ میں جلسوں اور کانفرنسوں کے ہنگامے زیادہ پسند تھے۔ پھر ۱۹۱۹ء کا طوفان اور شورش زمانہ تھا جبکہ مغربی حکومتوں نے خلافت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرکے، مصر، شام، فلسطین و عراق کو اپنے دہان حرص و آز کا لقمہ بنا لیا تھا۔ اور اسلامی ہندوستان میں پشاور سے راس کماری تک صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ بھلا مولانا کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ اپنے استاد حضرت مولانا بشیر احمد صاحب کے ساتھ جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ اور جلد ہی سیاست کے میدان میں اپنا ایک مستقل مقام پیدا کر لیا۔

اپنے ان دینی و علمی و سیاسی بزرگوں کا مولانا کے دل میں بڑا احترام تھا جس کا ذکر کرتے بڑے ادب کے ساتھ کرتے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح کے بعد کے زمانہ میں سیاسی اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا عثمانی جمعیتہ علماء اسلام کے صدر الصدور تھے۔ جو مسلم لیگ کی پشت پناہ تھی۔ اور ہمارے مولانا مجلس احرار اسلام کے صدر تھے۔ جو کانگریس کا بازو بھی جاتی تھی۔ مگر ذاتی مخلصانہ تعلقات میں کبھی فرق نہ آیا اور خط و کتابت بھی برابر جاری رہی۔ فہم قرآن کریم میں مولانا علامہ عثمانی رح کو بے مثل قرار دیتے تھے۔ اور ان کے فوائد القرآن کا اکثر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

ملک کی سیاسیات اور دیوبند کے انتظامی معاملات میں اختلاف آراء کی وجہ سے اکابر دیوبند کے حلقوں میں پہلی سی وحدت و جمعیت باقی نہ رہی تھی۔ مولانا کو اس صورت کی دکھن ہوئی۔ وہ سب کی خدمت میں جاتے اور جس سے جس درجہ کے تعلقات تھے ان کو نبھاتے۔

ایک دن دیوبند سے واپسی پر مجھ سے فرمانے لگے۔

"قاضی صاحب، جس طرح برہمن مندر میں جا کر ہر چھوٹے اور بڑے بت کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے۔ اور پھول چڑھاتا ہے۔ اسی طرح میں تو دیوبند میں سب بزرگوں کی خدمت جاتا ہوں اور ان کی دعائیں لیتا ہوں۔ میرے تو سب بزرگ ہیں۔ سب مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں کسی گروہ بندی میں کیوں شریک ہوں؟"

"شیخین" سے محبّت

حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری رح کے عاشق صادق تھے ان کے فضائل و مناقب کا ذکر کر کے وجد کیا کرتے۔ کہا کرتے کہ مجھے قرآن فہمی کا ذوق حضرت شاہ صاحب کی صحبت میں حاصل ہوا ہے۔ حضرت شاہ صاحب بھی ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ ایک بار مولانا جیل میں تھے۔ حضرت شاہ صاحب ان کے مکان پر لدھیانہ پہنچ گئے۔ بیٹھک صاف نہ تھی۔ جھاڑو لیکر حضرت شاہ صاحب نے خود اس کی صفائی کر ڈالی۔ گھر والوں نے حضرت شاہ کو روکا تو آپ نے فرمایا۔ یہ میرا گھر ہے۔ گھر والے اپنے گھر کی صفائی کیا ہی کرتے ہیں۔

بہر حال ایک طرف حضرت شاہ صاحب سے اس قدر گہرے تعلقات تھے دوسری طرف حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی محبت و عقیدت میں کسی سے کم نہ تھے۔ حضرت شیخ کو اپنا سیاسی رہنما سمجھتے تھے۔ حضرت شیخ بھی مولانا سے بڑی شفقت فرماتے۔ دہلی میں حضرت کا قیام دفتر جمعیتہ علماء ہند میں ہوتا۔ اور اکثر صبح کی چائے مولانا کے ہاں نوش فرماتے۔

"امیر ملت" سے عقیدت

زندہ بزرگوں میں حضرت شیخ الاسلام رح کے علاوہ حضرت

امیر ملت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری مدظلہ العالی سے بڑی عقیدت، وارادت تھی۔ مولانا اور ان کے فرزند حضرت رائے پوری سے بیعت بھی تھے۔ ہر دوسرے تیسرے ماہ مولانا رائے پور تشریف لے جاتے اور کئی کئی روز حضرت کے ہاں قیام کرتے۔ حضرت بھی دہلی تشریف لاتے تو اگرچہ مستقل قیام باڑہ کی ایک مسجد میں ہوتا۔ مگر مولانا کے ہاں بھی ایک دو روز ٹھہرتے۔ حضرت رائے پوری سے نسبت کی سعادت اتفاقاً کو بھی مولینا ہی کے دولت کدہ پر ان ہی کی سفارش سے حاصل ہوئی۔ اور یہ مولانا کا مجھ پر ایسا احسان ہے جسے میں تا قیامت نہیں بھول سکتا۔ اور قیامت کے بعد بھی کیوں بھولوں گا۔ کہ انشاء اللہ تعالے اس تعلق کے ثمرات سے متمتع ہونے کا اصل وقت وہی ہوگا۔

ایک روز مولانا کی مجلس میں ۱۹۴۷ء کے حوادث کا ذکر تھا مجھ سے خطاب کر کے مولانا نے فرمایا۔ تمہیں معلوم ہے کہ فسادات کے یہ شعلے جنہوں نے پنجاب کو بھسم کر کے رکھ دیا تھا جمنا کے کنارے آکر کیوں بجھ گئے۔ تین بزرگ تھے جن کے گریہ نیم شبی نے اس آگ کو ٹھنڈا کیا ہے۔ حضرت مدنی حضرت رائے پوری اور تیسرے ایک اور بزرگ کا نام لیا۔ میں ان کا نام بتانا نہیں چاہتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں ان کا نام لکھ دوں تو وہ مجھ سے سخت ناراض ہو جائیں گے۔ اور ان کے فقیرانہ دستر خوان پر مجھے جو شاہانہ نعمتیں سفر رائے پور کے راستہ میں ملتی ہیں بند ہو جائیں گی۔

حبیب آغوش محبوب میں

حضرت مولانا مرحوم سے تعلقات کا آغاز جس طرح ناگہانی طور طور پر ہوا۔ قدرت کو اس کا اختتام بھی اسی انداز پر کرنا تھا۔ اب ذرا جگر تھام کر اس کا ذکر بھی سن لیجئے۔

مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے انخلاء کا حضرت مولانا کو بڑا غم تھا۔ یہ ایک طرف مولانا کے سینہ کا زخم تھا جو برابر رستا رہتا تھا تو دوسری طرف وہ اسے ہندوستان کی سیکولر حکومت کی روشن پیشانی کا داغ بھی سمجھتے تھے۔

آخر حضرت رائے پوری مدظلہ العالی کی سرپرستی میں مولانا مرحوم نے ۱۹۵۶ء کے وسط میں "انجمن حمایت اسلام" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اور منظم طریقہ پر مشرقی پنجاب میں مساجد ومقابر کے انخلاء اور وطن میں رہتے ہوئے بے وطن مسلمانوں کی آبادکاری کا کام شروع کر دیا۔

اس انجمن کا پہلا باضابطہ جلسہ مولانا نے یکم ستمبر ۱۹۵۶ء کو اپنے دولت کدہ پر بلایا۔ مشرقی پنجاب۔ دہلی اور یوپی سے مولانا کے وہ احباب جو اس کام میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جمع ہوئے۔ جلسہ حضرت مولینا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی صدارت میں صبح سے شام تک جاری رہا۔ اور اس میں کام کا ایک واضح نقشہ بنا لیا گیا۔ جلسہ ختم ہو جانے کے بعد مولانا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور فرمایا کہ آج میرے سینہ کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

اکثر شرکاء جلسہ اسی روز شام کو رخصت ہو گئے۔ میں نے چاہا کہ مہتمم صاحب کے ساتھ جو اپنی کار کے ذریعہ دیوبند روانہ ہو رہے تھے۔ میں بھی سوار ہو جاؤں۔ اور راستہ میں میرٹھ اتر جاؤں۔ مگر اجازت نہ ملی۔ اور مجھے روک لیا گیا۔

بعد نماز مغرب دارالعلوم دیوبند کے مصری استاد تشریف لے آئے۔ ان سے دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ پھر نماز عشاء کے بعد کاظمی صاحب سے اور مجھ سے انجمن کے کام کے متعلق سونے کے وقت تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس رات گرمی زیادہ تھی۔ مولانا کو اطمینان کی نیند نہ آئی۔ میری آنکھ بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھلتی رہی۔ صبح چار بجے کے قریب مولانا بستر سے اٹھ گئے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر وضو کیا۔ پھر جا نماز بچھا کر اپنے مولیٰ کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ میں مکان کے باہر والی مسجد میں چلا گیا۔ علی الصباح مولانا کا معمول کمپنی باغ تک ٹہلنے کے لئے جانے کا تھا۔ مگر اپریشن کے بعد سے جسے دو ماہ گزر رہے تھے۔ رکشا میں آتے جاتے تھے۔ اس روز خلاف معمول پیدل واپس ہوئے اور راستہ بھر دکانداروں اور محلہ والوں سے سلام و مصافحہ کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا کے ہاں صبح کا ناشتہ بہت سویرے ہوتا تھا۔ مولانا کے تشریف لاتے ہی دستر خوان بچھا دیا گیا۔ حضرت مولانا بیت الخلاء سے فارغ ہو کر تشریف لائے تو میں تعظیماً کھڑا ہونے لگا مولانا نے محبت کے ساتھ کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا اور ہنس کر فرمایا۔ میں تو پنجابی ہوں۔ پھر آپ میرے ساتھ یوپی کی تہذیب کیوں چلاتے ہیں! میں نے عرض کیا۔ جب میرے اور آپ کے تعلقات ہیں تو تہذیب بھی ملی جلی چلنے دیجئے۔ گفتگو کے دوران میں ہی مولانا محمد احمد کاظمی ایم۔ پی (مرحوم) تشریف لے آئے، مولانا نے فرمایا۔ لیجئے اب مشرقی یوپی اور بہار کی تہذیبوں کے نمائندے بھی آ گئے۔ الغرض ناشتہ کے دوران حضرت مولانا اپنی شیریں گفتار سے کام و دہن کے ساتھ دل و دماغ کی ضیافت کا سامان بھی فرماتے رہے۔

ناشتہ سے فراغت کے بعد مولانا زنانخانہ میں تشریف لے گئے۔ وہیں بیت الخلاء جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اسی دوران میں اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ لڑکھڑاتے ہوئے نکلے اور چارپائی پر گر گئے۔ کلمہ طیبہ پڑھا۔ اور رحمان کا حبیب اپنے محبوب کی آغوش رحمت میں پہنچ گیا۔

گھر میں آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔ دوسروں کیساتھ میں بھی افتاں و خیزاں گھر میں پہنچا۔ حضرت مولانا بستر مرگ پر دراز تھے۔ نورانی پیشانی پر پسینہ کے موتی لرزاں تھے اور خاموش ہونٹوں پر تبسم کی موجیں رقصاں تھیں۔

"حیف کہ در چشم زدن صحبت یار آخر شد"

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۸ سے آگے)

العزیز نے جواب دیا کہ میں ایسے بالا بلندوں سے خطاب کے قابل نہیں ہوں۔ لہٰذا آپ تکلیف گوارا نہ کریں۔ اس قصّہ کو میں نے قادیان کے جلسہ میں ذکر کیا۔ جبکہ حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور بے تکلفانہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اس وقت شاہ صاحب نے فرمایا کہ بڑی بے وقوفی کی۔ دل چاہتا تھا تو سیدھے چلے جاتے۔ وہاں جا کر دل چاہتا تقریر کرنے کو تو عرض کر دیتے۔ میں نے کہا ایک میری بھی پیشینگوئی یاد رکھیئے۔ وہ یہ کہ آپ جس وقت خانقاہ امدادیہ کا بیرونی دروازہ گزریں گے تو سب خیالات دماغ میں کافور ہو جائیں گے۔ چنانچہ بات ختم ہوئی اس کے تھوڑے عرصہ بعد خود بخود بلا اطلاع تھانہ بھون چلے گئے اور خود اپنا تعارف کرایا۔ حضرت متوجہ ہوئے اور شفقت سے باتیں کیں۔ پھر رخصت ہوئے۔ پھر آخری ملاقات لاہور کے قیام میں آخری دن میں ہوئی۔ جبکہ سب کو ملاقات کی اجازت تھی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں مقام قرب و رضا نصیب فرمائے اور اولاد کو توفیق صبر دیکر ان کے نقش قدم پر چلائے۔

۵۔ جب خیرسگالی وفد کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان آئے۔ تو میں ان کو لاہور ملا۔ جب ملتان آنے کا پروگرام ہوا پہلے سیدھے مدرسہ خیر المدارس میں آئے اور ملاقات سے محظوظ فرمایا۔ یہ آخری ملاقات دنیا میں تھی اور اب ملاقات آخرت میں ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

مصروفیتوں میں کمی نہ آئی۔ لکھنؤ میں بیٹھ کر تمام یوپی میں مجلس احرار کی شاخیں قائم کیں، صوبے کا صدر دفتر لکھنؤ میں بنایا۔ اسی صدر دفتر میں کانگریس نے جب ۱۹۳۶ء وزارتیں قبول کیں تو یوپی کے تمام وزراء حافظ مشتاق سے مشورہ کرنے آتے تھے۔ وطن اجڑنے تک مولانا کا ساتھ نہیں چھوڑا

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۸ سے آگے)

وہاں جا کر سیاسی کام بھی کرو۔ اور اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بھی بٹاؤ۔ کاروبار کا سوائے چوپٹ ہو جانے کے اور کیا بنتا تھا۔ سیاسی کاموں کی وجہ سے یہاں نوں کی زیادتی مصروفیت کی وجہ سے دوکان بند۔ پونجی کب تک ساتھ دیتی۔ آخر مفلسی نے گھر میں بسیرا کر لیا۔ بڑے گھر کی کھرچن بھی تھوڑی نہیں ہوتی۔ دال روٹی چلتی رہی۔ لیکن سیاسی

"اے رئیس الاحرار"

(انور انصاری گنگوہی)

دشمنوں کیلئے تھا تیغ براں ۔ خوں فشاں و بے اماں
تیری ہیبت سے عدو تھا لرزاں ۔ بے شبہ و بے گماں
تیری تقریر تھی گویا طوفاں!! تند و تیز و بیکراں
تو نے لرزائے فرنگی ایواں ۔ اے حبیب الرحمٰن!

روح آزادی ہوئی ہے بیدار ۔ تھے وہ تیرے افکار
چشم دشمن میں چبھا تھا ہر بار ۔ بنکے تو مثل خار
ملک و ملت کا تو ہی تھا معمار ۔ اے رئیس الاحرار!
تو نے آزاد کرایا ہندوستاں ۔ اے حبیب الرحمٰن!

کر دے پامال حکومت سے تجھے ۔ بربریت سے تجھے
چاہا مرعوب رعونت سے تجھے ۔ کر لے طاقت سے تجھے
روک سکتا تھا اذیت سے تجھے ۔ کوئی صداقت سے تجھے؟
تو مجسم تھی صداقت کی زباں ۔ اے حبیب الرحمان!

تو نے افرنگ کا توڑا افسوں ۔ یکساں و بے چگوں
دم کے دم میں وہ ہوا ہے محزوں ۔ اور وطن سے بیروں
کر کے چھوڑا ہے وطن کو ماموں ۔ غیر سے مصئوں
پیکر عزم جواں کوہ گراں ۔ اے حبیب الرحمٰن!

خدمت دین و وطن شیوہ تھا ۔ جس کا تو شیدا تھا
تجھ کو ہر ایک نفس پیارا تھا ۔ سب کا تو پیارا تھا
عزم و ایثار میں ہاں یکتا تھا ۔ علم کا گہوارہ تھا
لوح ہستی پہ تھا کامل انساں ۔ اے حبیب الرحمٰن!

راز کھولا ہے دغا بازی کا ۔ سر سید کی غلامی کا
جال توڑا ہے فسوں کاری کا ۔ فتنۂ مرزائی کا
درس پہلے پہل آزادی کا ۔ وطن آبادی کا
تیرے آباء نے دیا مرد میداں ۔ اے حبیب الرحمٰن!

پیارے بھائی رحمانی!
محترم مولانا صاحب کے متعلق لمبا مضمون لکھنے کی فرصت شاید نہ مل سکے۔ چند سطور لکھتا ہوں اچھی لگیں تو شائع کر دیجیئے ——— (رنبیر)

محترم رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان کی یاد آتے ہی ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اب بھی زندہ ہیں۔ اب بھی کچھ ہی دیر بعد آ نکلیں گے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہیں گے۔ "کہو بھائی۔ ملک کے لئے کچھ کام بھی کرتے ہو یا صرف مضمون ہی لکھتے رہتے ہو؟" اور مَیں جلدی سے اُٹھ کر آداب بجا کر کہوں گا "آپ حکم کیجئے۔ جو بھی آپ کہیں گے وہ مَیں کرونگا ضرور" ——— ایسی تھی اُن کی شخصیت۔ کچھ لوگ زندہ ہونے پر بھی مرے سے لگتے ہیں، وہ رحلت فرمانے کے بعد بھی زندہ معلوم ہوتے ہیں۔ آج وہ اس دُنیا میں نہیں ایسا یقین ہی نہیں ہوتا۔

اور اُوپر جو فقرہ مَیں نے اُن کی طرف سے لکھا۔ "کہو بھائی ملک کے لئے کچھ کام بھی کرتے ہو یا مضمون ہی لکھتے رہتے ہو" جیسے اُن کے جیون کے مشن کا آئینہ ہے۔ اِس میں تین الفاظ ہیں۔ "بھائی" "ملک" اور "کام" ——— اور اُن کے مہان جیون کو دیکھتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین الفاظ ہی اُن کے سارے جیون کی بنیاد تھے۔ ملک کا ہر آدمی اُن کے لئے "بھائی" تھا۔ اپنا تھا، کوئی پرایا نہیں ہر وقت وہ "ملک" کے لئے سوچتے تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی نیتا تھے وہ۔ لیکن اُن کا پیار صرف مسلمان کیلئے تو نہیں تھا۔ اُنہیں جتنا صرف اُن کے لئے نہیں تھی۔ جو اسلام میں عقیدت رکھتے ہیں بلکہ سب کے لئے تھی۔ سارے ملک کے لئے۔ اُن کا مذہب اُن کی دلیش بھگتی کے راستہ میں کبھی حائل نہیں ہوگا۔ بلکہ اسی مذہب کی وجہ سے اُنہوں نے ملک کو پیار کرنا سیکھا۔ ملک کے ہر آدمی کو پیار کرنا سیکھا اور اس کی آزادی کے لئے جدوجہد۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا، اپنے سارے جیون کی قربانی دینا سیکھا۔ تفاصیل میں جائے بغیر کہنا چاہتا ہوں۔ کہ انہوں نے اپنی دلیش بھگتی کے ذریعے اور اپنے پیار بھرے جیون کے ذریعے اسلام کا سچا اور عملی ادب سب کے سامنے رکھا۔ ایسا رُوپ رکھا۔ جس کے لئے من میں عزت پیدا ہوتی ہے، احترام پیدا ہوتا ہے۔ جس کے لئے پرائے پن کا جذبہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کاش! کہ نہ صرف دوسرے مسلمان، بلکہ اپنے اپنے دھرم میں وشواس رکھنے والے دوسرے لوگ بھی محترم مولانا کی طرح اپنے دھرم کو اس پیار بھرے حریت پسندانہ اور ہمدردانہ رُوپ میں عملی جیون سے پیش کر سکیں۔ تو پھر مذاہب کی اپنی اپنی ہستی کے باوجود آپسی کشمکش ختم ہو جائے۔ وہ زہر ختم ہو جائے جو انگریز نے ہمارے ملک میں پیدا کیا ——— لیکن ملک کے لئے محض سوچنے سے تو کام نہیں چلتا۔ آزادی سے پہلے ہمیں آزادی کے لئے لڑنا پڑا" تا تھا۔ آزادی کے بعد ہمیں اسکو مضبوط اور مستحکم بنانا ہے۔ یہ سب کچھ باتوں سے نہیں ہوتا۔ "مضمون لکھنے" سے نہیں ہوتا۔ اس کے لئے

کام کرنا پڑتا ہے۔ لگاتار، بنا تھکے، بنا رُکے، بنا ڈگمگائے
— اور محترم مولانا کا سارا جیون "اس کام" سے بھرپور
تھا۔ وہ خود کام کرتے تھے۔ دوسروں سے کراتے تھے۔ جب
بھی میں نے ان کے درشن کیے تبھی معلوم ہوا کہ وہ ایک نئی مہم
چلا رہے ہیں۔ آج غلامی کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ آج آزادی
کو محفوظ رکھنے کے لئے مصیبتیں برداشت کرنی ہیں۔ آج اتحاد
کو مضبوط بنانے کے لئے ملک بھر میں ایک آندولن چلانا ہے۔
آج غداری کے خلاف۔ رجعت پسندی کے خلاف، فرقہ
پرستی کے خلاف۔ زبان پرستی کے خلاف اور علاقہ پرستی کے
خلاف ایک ناقابلِ تسخیر جذبہ پیدا کر دینا ہے۔ آج
دوسرے دیشوں میں اپنے ملک کے لئے عزت پیدا کرنی ہے

یہی کچھ وہ کرتے رہتے تھے۔ وہ "گفتار کے غازی" تھے ضرور
اسطرح تقریر کرتے تھے کہ سامعین کے دل ہل جائیں، لیکن
اس کے ساتھ ہی ساتھ اور اس سے بہت زیادہ "کردار کے
غازی" بھی تھے۔ اس طرح کام کرتے تھے کہ انکے بڑھاپے
میں بھی جوانی کا گمان ہوتا تھا۔

آج ہم ان کی یاد مناتے ہیں تو اچھا ہے۔ لیکن میں کیا کروں!
مجھے اب بھی ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں گئے نہیں ہمارے
درمیان ہیں۔ زندہ ہیں اور کہہ رہے ہیں۔
"بھائی۔ ملک اور قوم —" ان تین الفاظ کو
یاد رکھو۔ ان میں تمہارے دیش کے بھوشیہ کی روشنی
چھپی بیٹھی ہے۔

بقیہ رئیس الاحرار کی تیس سالہ زندگی صـ۲۹

عبدالرحمن ماناؔ اگرچہ ان پڑھ ہے لیکن مولانا کی صحبت میں مسلسل
رہنے سے وہ ہندوستان کی سیاست کو بالکل صحیح اور ٹھیک
سمجھتا تھا۔ وہ ان پڑھ فرد تھا۔ لیکن واقعات کی روشنی میں
اس کا ذہن صحیح نتیجے پر پہنچتا تھا۔ ارادے کا اٹل۔ اصولوں
کا پابند ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک مولانا کا ساتھ دیا۔ جب
کبھی کسی تحریک کا آزادیٔ وطن کے لئے آغاز ہوا تو ایسا
کبھی نہیں ہوا کہ مانا قربانی کے میدان میں کسی سے پیچھے رہ گیا
ہو۔ آزادیٔ ہند کا یہ جانباز سپاہی جس نے مفلسی اور تنگ
دستی میں زندگی گذار کر بھی اُف تک نہیں کی جس کو دنیے والوں
نے بڑے سے بڑا لالچ دیکر خریدنے کی کوشش کی۔ لیکن اس
کی مفلسی کے سامنے سرمائے نے ہمیشہ شکست کھائی۔ بھکاری
کو سرمایہ اور دولت خرید سکتی ہے۔ قانون گنہگار کو ڈرا سکتا
ہے لیکن جس نے ظلم کے خلاف بغاوت کر کے مفلسی کو اپنے
گھر میں خود دعوت دی ہو۔ اس کی مفلسی کو کون خرید سکتا
ہے۔ جس نے سچائی کو ہاتھ میں لے کر باطل قانون کو چیلنج کیا
ہو۔ اسے کون ڈرا سکتا ہے۔ وہ سچائی پر جان کی بازی
لگا سکتا ہے لیکن باطل طاقت کے دباؤ سے وہ اپنی جگہ
کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اچھی صحبت نے سچ بات کہنے کا عادی
بنا دیا تھا۔ العلم وخاندان کے باب ہیں تو سینکڑوں نہیں
ہزاروں ہی تھے اور ہیں جو اس وقت بھی اور آج بھی منطقی
بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے قانون کی آڑ میں
باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن عبدالرحمن ماناؔ العلم دانست
کے عملی باب سے گزر چکا تھا۔ اس لئے کسی کی علمی بحث
اس کی زندگی کے رُخ کو بدل نہ سکی۔

حافظ مشتاق احمد لدھیانوی ذہین۔ تعلیم یافتہ
نوجوان لکھنے پڑھنے کا دھنی۔ مولانا کو اس سے بے حد محبت
اولاد کی طرح پیار، ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ناز و نعم میں
پرورش پائی۔ مولانا جیل میں آئے تو یہ کیسے باہر رہ
جاتے۔ ماں نے چہرے سے بیٹے کے ارادوں کو بھانپ لیا۔
پوچھنے سے پہلے خدمت وطن کے لئے اجازت دے دی۔
ہار پہنائے دولہا بنا کر پیشانی کو ایک بوسہ دیا۔ آنکھیں پرنم
ہو گئیں۔ جاؤ بیٹا وطن کی آزادی کے لئے اگر جان تک بھی
دینی پڑے تو پیٹھ نہ موڑنا۔ ان آنسوؤں کی لاج رکھنا اگر تم
پیٹھ موڑ کر آگئے تو میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ بیٹا ماں کی
دعائیں لیکر جیل میں مولانا کے پاس پہنچ گیا پھر جبتک لدھیانہ
آباد رہا مولانا کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ رہائی کے بعد مولانا نے
حافظ صاحب کو لکھنؤ جانے کے لئے کہا کہ (باقی صـ۲۵)

۱۹۲۱ء کی تحریک آزادی سے لیکر ۱۹۴۵ء تک بطل حریت مجاہد جلیل رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی نوراللہ مرقدہ کتنی ہی بار جیل گئے۔ مندرجہ ذیل مضمون میں رئیس الاحرار کی زندگی کا ابتدائی نقش مولانا خلیل الرحمٰن صاحب لدھیانوی نے ترتیب دیا ہے۔ یہ اہم اور بنیادی مضمون ناظرین الحبیب کے لئے (الحبیب) کے رئیس الاحرار نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ——— (رحمانی)

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخلِ آدابِ زنداں ہو گیا

۱۹۲۱ء میں جب کانگرس کی تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت کا آغاز ہوا اور دنوں میں ہی تحریک آزادی شباب پر پہنچ گئی۔ لوگ پروانہ وار اپنے لیڈروں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جیلوں میں جا رہے تھے۔ اس وقت لدھیانہ کے گلی کوچوں میں "ہندو مسلم بھائی بھائی" "انگریز کو ہندوستان سے نکال دو" کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ مولانا نے حالات کا جائزہ لیا اور ایک تقریر سے شہر کے لوگوں کو اپنی رہنمائی سے نوازا۔ آپ کی ایک ہی تقریر سے شہر میں آگ لگ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں نوجوان رضاکار بھرتی ہو گئے۔ معززین شہر نے آپ کا ساتھ دیا۔ چند یوم میں آپکی آواز پر ہزاروں رضاکار سول نافرمانی کرتے ہوئے جیل میں پہنچ گئے۔ معززین شہر کو گرفتار کر لیا۔ آخر میں حکومت نے ۲۱ دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح کو ۹ بجے آپ کو بھی گرفتار کر لیا۔ آپ پر اور آپکے تمام ساتھیوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمہ میں آپ کو چھ ماہ قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ آپ کے تمام ساتھیوں اور رضاکاروں کے مقدمات کی سماعت کچہری کی عدالت میں نہیں ہوئی بلکہ آپ کے مقدمہ کی سماعت کیلئے عدالت کا اجلاس جیل کے اندر ہوا۔ اور جیل میں ہی مقدمے کا فیصلہ بھی سنایا گیا۔ حکومت کو خطرہ تھا کہ اگر آپ کو عدالت میں لایا گیا تو شہریوں کے بے پناہ ہجوم کو کنٹرول نہیں کیا جا سکے گا جیل میں رضاکاروں کے علاوہ آپ کے ساتھ شہر کے معززین میں سے مہاشہ گھسیٹا رام صاحب مولانا محمد یحییٰ صاحب آپ کے چھوٹے بھائی اور ماسٹر تاج الدین صاحب اور ڈاکٹر سید یٰسین صاحب مرحوم تھے۔

لدھیانہ جیل میں آپ کی موجودگی تحریک آزادی کو زیادہ تیز کر رہی تھی۔ نوجوان اپنے شہر کے محبوب لیڈر کے پاس پہنچنے کے لئے دیوانہ وار سول نافرمانی کر رہے تھے جن کو گرفتار نہیں کیا جاتا تھا وہ جیل کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھ جاتے تھے۔ حکومت نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کے مقدمات کے ختم ہونیکے ساتھ ہی ایک دن اچانک آپکو۔ آپکے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب اور ماسٹر تاج الدین صاحب کو لدھیانہ جیل سے انبالہ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ تین دن تک آپ تینوں حضرات انبالہ جیل میں رہے۔ انبالہ جیل سے تین دن کے بعد آپ کو، اور آپکے دونوں ساتھیوں کو میانوالی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

مولانا کو میانوالی جیل میں دس دن تک قید تنہائی میں رکھا گیا اور ایسی کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ جہاں چوبیس گھنٹہ میں لانگری (روٹی دینے والا) اور بھنگی کے سوا کسی اور انسان کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کوٹھڑی کے باہر چوبیس گھنٹے تالا پڑا رہتا تھا۔ ساتھیوں کو مولانا کا علم نہیں تھا کہ جیل میں کس جگہ ہیں اور مولانا کو اپنے ساتھیوں کی خبر نہیں تھی۔ غالب کا یہ شعر ؂

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

صادق آتا تھا۔ شاید غالب مرحوم نے بھی یہ شعر اپنی اسیری کے زمانہ میں ہی کہا ہوگا۔ انگریز اور خنزیر کی خصلت بالکل ایک جیسی ہے۔ خنزیر دھول سے بھاگتا ہے اور انگریز پروپیگنڈے سے۔ آپکی اس قید تنہائی پر باہر عوام نے پرزور احتجاج کیا۔ چنانچہ دس دن کے بعد آپ کو آپکے ساتھیوں میں بھیج دیا گیا۔ ایسے مولانا احمد سعید صاحب۔ مولانا سید عطا اللہ شاہ صاحب بخاری پنڈت نیکی رام صاحب۔ مولانا ثناء اللہ صاحب پانی پتی۔ مولوی عبد المجید صاحب سالک۔ مدیر انقلاب۔ مولانا محمد داؤد غزنوی۔ لالہ دیش بندھو جی گپتا اور لالہ شنکر لال صاحب میانوالی جیل میں آچکے تھے۔ ان حضرات کے علاوہ ڈیڑھ صد کے قریب اور پولیٹیکل قیدی تھے۔ تین چار ماہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گذرنے پائے تھے کہ جون ۱۹۲۲ء میں تنہا آپ کو میانوالی جیل سے دھرم سالہ جیل ضلع کانگڑہ میں منتقل کر دیا گیا۔ دھرم سالہ جیل میں اس وقت ہندوستان کے مشہور و معروف لیڈر لالہ لاجپت رائے سرگباشی موجود تھے۔ لالہ جی کے ساتھ قید کے دن بہت اچھے گذر رہے تھے کہ مولانا کی رہائی کی تاریخ قریب آگئی۔ ۶ اگست ۱۹۲۲ء کو آپ کی سزا کے چھ ماہ پورے ہوجاتے تھے۔ اچانک آپ کو تاریخ رہائی سے چار یوم پہلے پولیس لدھیانہ جیل میں لے آئی۔ لدھیانہ جیل میں آ کر دوسرا وارنٹ دکھایا گیا۔ آپ کی قید کے چھ ماہ پورے ہوجانے کے باوجود لدھیانہ شہر میں ابھی لوگوں کے جذبات مردہ نہیں ہوئے تھے۔ حکومت کو خدشہ تھا کہ ایسے حالات میں مولانا کی رہائی کہیں دوبارہ تحریک کے آغاز کا سبب نہ بن جائے۔ چنانچہ آپ پر دوسرا

کیس تیار کر کے مقدمہ چلا دیا گیا۔ مقدمہ کی سماعت اس مرتبہ بھی جیل میں ہوئی اور جیل کے اندر ہی عدالت نے اس مقدمہ میں ایک سال سزا کا حکم سنا دیا۔ حکم سنانے کے بعد آپ کو واپس پولیس نے دھرم سالہ جیل میں پہنچا دیا۔ اب آپ دھرم سالہ جیل میں پہنچے تو لالہ جی سرگباشی کے علاوہ شیخ حسام الدین صاحب امرتسری بھی موجود تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد شیخ صاحب کی قید ختم ہوگئی اور وہ رہا ہوکر امرتسر پہنچ گئے۔

قید کے ساتھ ساتھ مولانا پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ بھی ہوا تھا آپ نے جرمانہ دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی۔ ایک شام مغرب کے بعد پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے مولانا کے مکان کو گھیر لیا۔ اس وقت گھر میں مولانا کی مرحوم اہلیہ اور آپ کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے علاوہ کوئی بھی موجود نہ تھا۔ پولیس کے پاس گھر کے تمام سامان کی قرقی کا وارنٹ تھا۔ جو آپکی اہلیہ کو دکھایا گیا۔ آپ کی اہلیہ نے پولیس کو اپنی کارروائی کرنے کے لئے بخوشی اجازت دیدی۔ پولیس نے گھر کا تمام سامان حتیٰ کہ روزانہ استعمال کے برتن توا اور دست پناہ تک بھی اٹھا لیا گیا زنانہ پولیس کے ذریعہ آپ کی اہلیہ کا زیور اور دونوں چھوٹی بچیوں کے کانوں سے بالیاں تک اتروالی گئیں۔ اگلے دن صبح کو یہ تمام سامان کوتوالی کے سامنے نیلام کر دیا۔ حکومت نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کا یہ اقدام جیل میں مولانا کے ارادوں کو متزلزل کر دے گا۔ لیکن یہاں یہ حال تھا کہ ؂

ادھر آ او ظالم ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

(۱۶ اگست ۱۹۲۳ء کو آپ اپنی تمام قید ختم کر کے رہا ہوئے لدھیانہ پہنچے گھر کی تباہی ڈیوڑھی سے ہی نظر آرہی تھی۔ بارش سے گھر کی چہار دیواری جو کچی تھی گر چکی تھی۔ سامان ضبط ہو چکا تھا۔ دیوار گر جانے سے بے پردگی ہونے لگی۔ آپ کی اہلیہ نے رسّی کھینچ کر اس پر پھٹے ہوئے کپڑے کچھ ٹاٹ کے ٹکڑے ڈال کر دن گزار دئے۔ گھر میں پہلے ہی کیا تھا پھر جہاں پولیس توا اور دستگیر تک اٹھا کر لے گئی ہو اس گھر میں چوری کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گھر کی غربت سامان کی ضبطی آپ کے ارادوں

کو متزلزل نہ کر سکی ۔ آپ نے اپنی اہلیہ کے چہرے پر بھی کوئی شکن نہ پایا۔ بلکہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک آپ کی معاون رہیں ۔ گھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار چند دوستوں کی توجہ سے بن گئی۔ تھوڑے سے برتنوں کے ساتھ گھر کا کام چلتا رہا ۔ گھر کا اُجڑنا ۔ سامان کی ضبطی آپ کے لئے نئی بات نہیں تھی جس سے کہ آپ یا آپکی اہلیہ متاثر ہوتیں۔ آپکے دادا مولانا محمد صاحب اور آپکی اہلیہ کے والد مولانا عبدالعزیز صاحب دونوں حقیقی بھائی تھے ۔ اس لئے میاں بیوی یہ جانتے تھے ۔ کہ ان کے بزرگوں نے جب ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا تھا تو ان پر مصائب کس طرح ٹوٹ پڑے تھے۔ مکانات کو صرف ضبط ہی نہیں کیا گیا تھا بلکہ مسمار کر دئے گئے تھے۔ مکانوں کے علاوہ مسجد بھی مسمار کر دی گئی تھی۔ نہ رہنے کے لئے گھر تھا نہ اوڑھنے کے لئے کپڑا ۔ اس کے باوجود حکومت اپنے تشدد سے آپ کے بزرگوں کو نہ دبا سکی اور نہ کسی لالچ سے خرید سکی۔ اس لئے ضبطی سامان کا واقعہ مولانا ۔ ان کی اہلیہ اور ان کے تمام خاندان کے لئے تعجب خیز نہ تھا ۔ خاندان کا ایک ایک فرد جانتا تھا کہ جو راستہ ہمارے بزرگوں نے اختیار کیا تھا اور جس پر ہم چل رہے ہیں اس راستے میں اس سے بھی زیادہ مصائب اور آلام پیش آتے ہیں ۔ طبیعتیں ایسے تلخ واقعات سے خاندانی طور پر عادی بن چکی تھیں۔ اس لئے اس واقعہ کی تلخی کو بھی انگبیں سمجھ کر پی گئے اور جیل سے آتے ہی پھر انگریزی اقتدار کے خاتمہ کے لئے مصروف عمل ہو گئے۔

۱۵ اگست ۱۹۲۷ء کو چند قابل اعتراض تقاریر کی بنا پر پھر آپکو گرفتار کر لیا گیا ۔ عدالت نے ایک سال کے لئے ضمانت طلب کی ۔ لیکن آپ نے ضمانت دینے کی بجائے ایک سال جیل میں منتقل کر دیا گیا ۔ جیل میں آپ بالکل تنہا تھے ۔ اسی جیل میں آپ پیچش جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور چار ماہ تک اس مرض نے آپکو گھیرے رکھا جسکی وجہ سے آپکی انتوں اور معدے کا ہضم ہمیشہ خراب ہو گیا ۔ اور آجتک آپکی خرابی صحت کی وجہ اسی پیچش کے حالات ہیں
۱۴ اگست ۱۹۲۸ء کو آپ پوری ایک سال قید ختم کر کے رہا ہو گئے ۔

اسٹیشن پر کئی ہزار ہندو مسلمان مرد اور عورتوں کا اجتماع ہو گیا۔ صبح دس بجے کے قریب گاڑی لاہور کی طرف سے لدھیانہ پہنچی ۔ مولانا کو دیکھتے ہی ہجوم نے مولانا حبیب الرحمان زندہ باد ۔ انقلاب زندہ باد ۔ ہندو مسلم بھائی بھائی کے پُر زور نعرے بلند کئے ۔ پولیس کافی تعداد میں اسٹیشن پر پہلے ہی موجود تھی ۔ کپتان پولیس خود بھی انتظام کے لئے اسٹیشن پر موجود تھا ۔ ایسے بے پناہ ہجوم میں سے نکال کر مولانا کو جیل تک لے جانا آسان کام نہ تھا ۔ اس لئے کپتان پولیس نے ڈپٹی کمشنر کی اجازت سے مولانا کو ریلوے انجن پر سوار کر دیا اور پولیس کے چند ذمہ دار افسران بھی اسی انجن میں سوار ہوئے ۔ اس انجن سے مولانا کو جیل کے قریب لا کر اتار دیا گیا۔ ریلوے لائن لدھیانہ جیل کے قریب سے گذرتی ہے۔ یہ اس لئے کیا گیا تاکہ لوگ اسٹیشن پر ہی دھوکے میں کھڑے رہیں اور مولانا کو پولیس اطمینان سے جیل تک پہنچا دے ۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا کہ مولانا ابھی انجن میں ہی تھے کہ ہجوم بھاری اکثریت میں جیل کے دروازے پر پہنچ گیا اب پولیس اور افسران کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ مولانا کو اسی ہجوم میں سے گذار کر جیل کے دروازے تک لے جائیں۔ مشتعل ہجوم کو کنٹرول کرنا آسان کام نہ تھا۔ ہجوم کا یہ مطالبہ کہ مولانا کو ہمارے سامنے چند منٹ کے لئے تقریر کرنے کی اجازت دی جائے افسران کو تسلیم کرنا پڑا ؎

ہر چہ دانا کند۔ کند ناداں لیک بعد از خرابیٔ بسیار

تقریر ۔ چنانچہ مولانا نے چند منٹ کے لئے پبلک کو مخاطب کیا اور فرمایا کہ "عدم تشدد ہمارا بنیادی اصول ہے ۔ اس اصول کو ہمیں کسی وقت بھی بھولنا نہیں چاہیے ۔ پُر امن رہتے ہوئے ہمیں ملک کی آزادی اور انگریزی اقتدار کے خاتمے کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانیاں دینی چاہیئں ۔ اسوقت ملک کو شور و ہنگامے سے زیادہ قربانی کی ضرورت ہے ۔ جو گرجتے ہیں وہ برسا نہیں کرتے ۔ عمل کرنے والے شور و ہنگامے سے کوسوں دور بھاگتے ہیں ۔ اگر آپ کو واقعی وطن سے محبت ہے تو آزادیٔ وطن کے لئے عمل کے میدان میں مظلوم بن کر حکومت کے ہر ظلم کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا

اپنا نصیب العین بنالو۔ مظلوم کی آہ خالی نہیں جایا کرتی۔ آپ یقین کیجئے کہ اگر ہندوستان میں کسی ایک فرد نے بھی خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ واقعی مظلوم بن کر انگریز کے ظلم کو اس نے برداشت کرلیا۔ تب یہ حکومت زیادہ دیر تک اپنے ظلم و تشدّد کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکے گی اور ہماری آنکھیں اپنے سامنے اس حکومت کو مٹتا ہوا دیکھ لیں گی۔

مولانا کی اس تقریر کا ہجوم پر اور پولیس پر بھی بے حد اثر ہوا۔ سب کی آنکھیں پُر نم تھیں۔ ہجوم پر کامل سکون چھایا ہوا تھا۔ کسی کے اونچے سانس لینے یا کھانسنے تک کی بھی آواز نہیں آرہی تھی۔ قریب پندرہ منٹ مولانا کی تقریر جاری رہی اور آخر میں آپ نے لوگوں کو پُر امن طریقے سے گھروں کو واپس لوٹ جانے کے لئے کہا۔ ہجوم اپنے محبوب رہنما کے حکم کو مانتے ہوئے واپس چلا گیا۔ اور مولانا کو جیل میں داخل کر دیا گیا۔

پھانسی کی کوٹھڑی

جیل میں ابھی بہت کافی رضا کار موجود تھے۔ لیکن ان کے ساتھ افسران جیل کا سلوک بہت خراب تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور ایسی باتیں پیدا ہوگئیں جنکی بنا پر مولانا کا افسران جیل سے جھگڑا ہوگیا۔ رضا کاروں کے ساتھ اس بے جا سلوک کے خلاف بھی مولانا نے بہت سخت قدم اُٹھایا افسران جیل نے آپکو فوراً پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا پھانسی کی کوٹھڑی میں بند ہونے کی خبر راتوں رات شہر کے ایک ایک گھر میں پھیل گئی۔ لوگ اس خبر کو سُنتے ہی بے چین ہوگئے شہر کے بچے بوڑھے۔ مرد اور عورتیں سبھی مولانا سے دلی پیار کرتے تھے۔

عورتوں کا جلوس

ہندو مسلمان عورتیں علی الصبح پانچ چھ ہزار کی تعداد میں جمع ہوگئیں۔ عورتوں نے مردوں کو کسی بھی قدم اٹھانے سے روک دیا۔ اور خود ایک جلوس بنا کر شہر کے بڑے بڑے بازاروں سے حکومت برباد کے نعرے لگاتی ہوئی جیل کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ جیل کے باہر جو چیز نظر آئی توڑ ڈالی۔ سول ہسپتال اور جیل بالکل ملے ہوئے ہیں۔ اس وقت سپرنٹنڈنٹ جیل سول سرجن تھے جو مسلمان تھے۔ جیل کی طرف سے اس مشتعل ہجوم کا رُخ ہسپتال کی طرف ہوگیا۔ سول سرجن صاحب بھاگ نکلے۔ لیکن ہسپتال کی تمام کرسیاں۔ میزیں۔ دواؤں کی شیشیاں۔ گملے۔ دروازوں کے شیشے جو چیز بھی سامنے آئی ہجوم کی دست بُرد سے بچ نہ سکی۔ عورتیں ڈاکٹر کے گھر گھس گئیں۔ اس کی بیوی سے کہا۔ ایسے ظالم انسان کی تم بیوی ہو جس نے مولانا کو پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ سمجھدار عورت نے ہجوم کے مزاج کو پہچان لیا تھا۔ وہ جانتی تھی اس وقت ہجوم کو سمجھانا بیکار ثابت ہوگا۔ وہ بھی ہجوم کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔ چند آنسوؤں کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔ گھر توڑ پھوڑ سے بچ گیا اور ہجوم مطمئن ہوکر واپس پھر جیل کی طرف چلا گیا۔ اب پانچ ہزار عورتوں کا یہ ہجوم دھرنا مار کر جیل کے سامنے بیٹھ گیا۔ افسران شہر اور جیل کے حکام عورتوں کے اس اقدام سے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ مولانا کو فوراً پھانسی کوٹھڑی سے نکال کر ان کی پہلی جگہ پر پہنچا دیا۔ پھر عورتوں کے اس ہجوم کو یہ اطلاع دی کہ مولانا کو پھانسی کوٹھڑی سے نکال دیا گیا ہے۔ اب آپ اطمینان سے گھروں کو جائیں۔ جب اس ہجوم کو واقعی یقین ہوگیا۔ تو واپس اپنے گھروں کو لوٹا۔

کمسن ساتھی عبدالرحمٰن عرف "ماما"

مولانا اب پھر رضا کاروں میں واپس آگئے۔ اس جگہ اگر آپ کے دو کم سن رضا کار ساتھیوں کا ذکر نہ کیا گیا تو یہ اُن کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہوگی۔ عبدالرحمٰن عرف "ماما" حافظ مشتاق احمد یہ دونوں بالکل نو عمر تھے۔ پندرہ سال سے کسی کی عمر زیادہ نہ تھی۔ جیل سے باہر ان دونوں کا ہر وقت مولانا کے پاس اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کی محبت مولانا کے ساتھ عشق کے درجے تک تھی اور یہ مگر اب آپ سے بہت دُور پاکستان کی بستیوں میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

اپنے میخانے کا اک میکش بے حال ہے یہ
ہاں وہی مرد جواں بخت و جواں سال ہے یہ
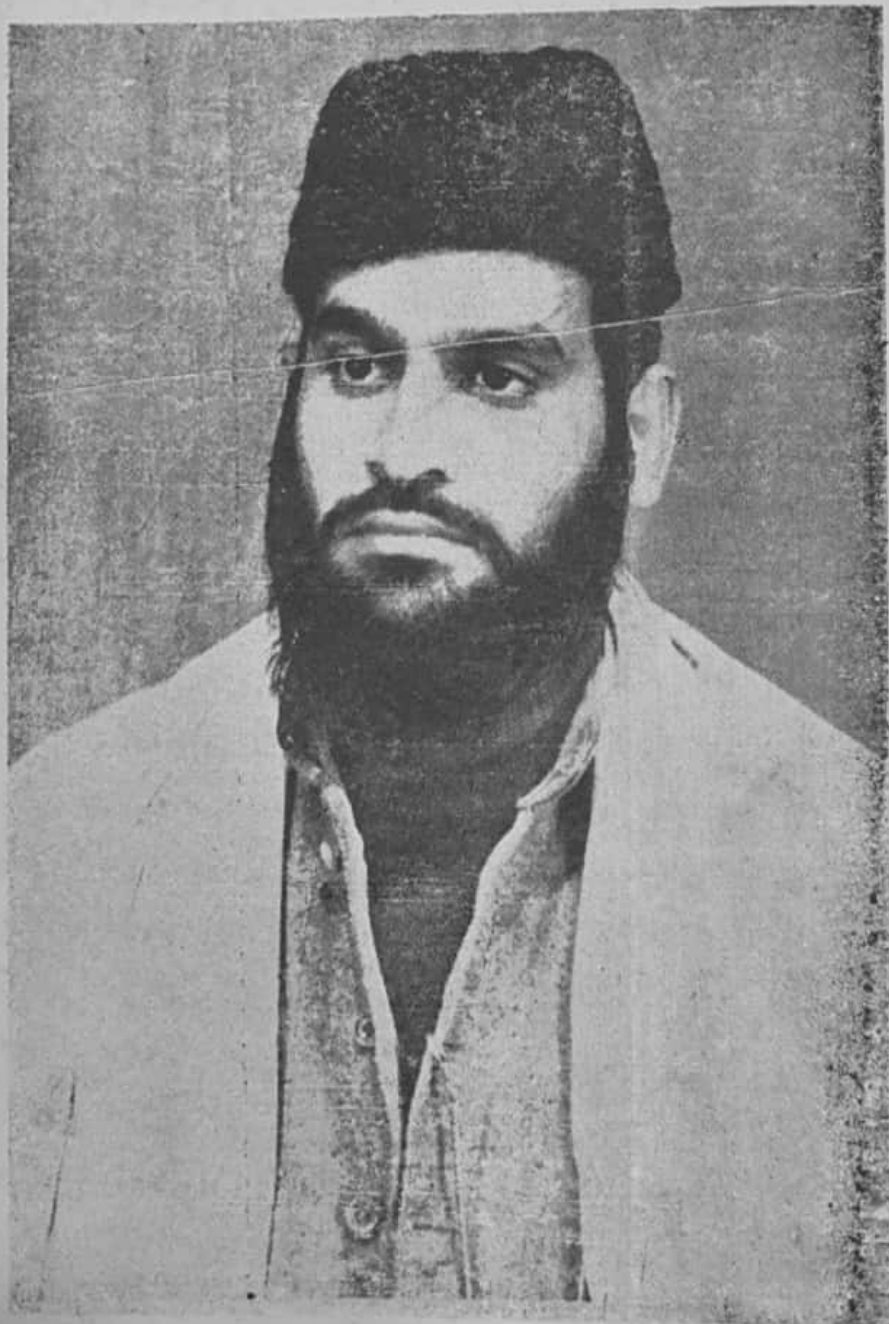
مدیر المجیب ——— محمد احمد رحمانی

نذرِ عقیدت

الحبیب کی شان میں

★ ——————— سودھی گورچرن سنگھ کوشاں ایڈیٹر سپیچ لدھیانہ

شمعِ کردار اندھیروں میں جلانے والے　　کاروانوں کو نئی راہ دِکھانے والے!
بختِ خوابیدۂ ملّت کو جگانے والے　　بے زباں قوم کی فریاد سُنانے والے!
چشمۂ علم و عمل خشک نہ ہونے پائے　　عزمِ احرار سے گلزار کھلانے والے!

رام کر سکتی نہیں گردشِ ایّام تجھے!
اس نے خود مان لیا عاشقِ اسلام تجھے!

باوفا شاہ بخاری[۱] کا وفادار ہے تو　　نیک بندوں کی محبّت ہی سے سرشار ہے تو
اپنے محبوب کا عاشق یا پرستار ہے تو　　فیضِ رحمٰن[۲] کا اِک ابرِ گہربار ہے تو
تیری تنظیم و ادارت ہی میں رحمانی[۳] ہے　　واقفِ حال ہے وہ کاشفِ اسرار ہے تو

اپنے بھارت سے محبّت ہی بڑھاتے دیکھا
اس کے دُکھ سُکھ میں تجھے کام بھی آتے دیکھا

کوئی کہتا رہے اپنوں کا ثنا گر تجھ کو　　ہندو مُسلم و سِکھ سب ہیں برابر تجھ کو
نُورِ اسلام کا جو کہتے ہیں پیکر تجھ کو　　ہے بجا سمجھیں جو اِک قوم کا رہبر تجھ کو
ایک دِن طرزِ صحافت ہی بتائے گا تِرا　　حُسنِ اخلاق و شرافت ہے مُیسّر تجھ کو

تیرے ہر لفظ میں تاثیرِ وفا مِلتی ہے
تیری ہر رمز میں توقیرِ خُدا مِلتی ہے

اَوج پائے گا جو ایوانِ محبّت تیرا　　پھیلتا جائے گا دامانِ محبّت تیرا
ہے حبیب آپ نگہبانِ محبّت تیرا　　جس نے گُل پوش کیا خوانِ محبّت تیرا
اپنی آواز میں کوشاں کی نَوا شامل کر　　ہو ضیا پاش یہ ایمانِ محبّت تیرا

"جس کی رحمت سے ہے قائم یہ نظامِ ہستی
اس کی بخشش سے ہی لبریز ہے جامِ ہستی"

(لدھیانہ ۸ جون ۱۹۶۲ء)

[۱] مجاہدِ وطن سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم [۲] رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم [۳] محمد احمد رحمانی مدیر الحبیب

وطن کے عظیم مفکّر اور پُر وقار رہنما

(لہر لدھیانوی)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مُشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پنجاب کا سرسبز خطہّ ہندوستان کے ماضی و مستقبل کا آئینہ رہا ہے اور بلاشک وشبہ آنے والے دور کی ہریالی کا ضامن ہے۔ جہاں اس سرزمین نے مُلک کی حفاظت کے لئے بہترین سپاہی پیدا کئے ہیں۔ وہاں جید علماءِ صاحب طرز مصنّف اور آسمانِ سیاست کے آفتاب و مہتاب بھی وطن کو بخشے۔

عصرِ حاضر کا سَر عظمت سے کتنا بلند ہو جاتا ہے۔ جب ہم ماضی کی روایات پر نظر دوڑاتے ہیں۔ ماضی کی دُھندلی راہوں سے مستقبل کا زریں غبار اُٹھتا ہُوا نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماضی کی شاندار یادگاروں پر ہی مستقبل کے سُہانے محلات تعمیر کئے جاتے ہیں۔

علوم و فنون، تہذیب و معاشرت، فنونِ لطیفہ اور آرٹ کے دُھندلے نقوش ہمیں ماضی کے مِٹے مِٹے ہوئے نقش و نگار سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ کاروانوں کی گرد راہ سے ہی کارواں کی حیثیت کی جھلک اُجاگر ہوتی ہے کہ وہ رفیع الشان تھا یا چند افراد پر مشتمل اور غریبیا الملکیت تھا۔

لدھیانہ کا ذکر چھیڑو تو ہماری زبان پر بے ساختہ وطن کے عظیم مفکّر، پُروقار رہنما اور فاضلِ مذہب و ملّت مولینا حبیب الرحمٰن صاحب کا نام گرامی آتا ہے۔ یالیوں کہو کہ لدھیانہ اور مولانائے محترم کا تذکرہ لازم و ملزوم ہے بلاخوف و رعایت۔ بلاامتیاز مذہب و ملت ہر وہ انسان جس نے تحریک آزادی کی تلخیاں چکھی یا دیکھی ہیں یا جس نے عروسِ آزادی کے محلوں سے تاک جھانک کی ہے۔ وہ مولانا صاحب کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کی ذات سرچشمۂ لطافت تھی۔ آپ کی ہستی ایک مستقل نُور کا مینار تھی۔ جو بیک وقت دلوں کو گرماتی تھی اور آنے والے دور کے شاہراہوں کو ضیا پاش کرتی تھی۔ آپ ایثار، سادگی اور الفت کا مجسّم تھے۔ حب الوطنی آپ کا مذہب تھا، خلوص، شرافت اور آدمیت آپکے گھر کی لونڈیاں تھیں۔

آپ مجلس احرار اسلام کے روحِ رواں تھے اور ہمیشہ اس مجلس کے صدر رہے۔ ہندوستان کے بلند پایہ مقررین میں آپکا شمار تھا۔ اور آپ نے جہاں علم و فضل اور طرز بیان سے سراب میں سفینے رواں کئے۔ وہاں ہندوستانی عوام کے دل میں محبت اور انقلاب کے بیج بھی بوئے۔ تاکہ یہ گلزار جب اپنے جوبن پر آئے تو مذہبی منافرت اور لادینی کا مقابلہ کرنے میں کسی پہلو سے نحیف و ناتواں نہ رہے۔ آپ بلا کے دُور اندیش تھے اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے ہمیشہ ہندومسلم منافرت کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کرنے میں اپنی زندگی صرف کر دی۔

وقت ہمیشہ انقلاب آمادہ ہے۔ اور اسی عمل پر قوانینِ قدرت کی تعمیل ہوتی ہے۔ عین ممکن تھا کہ مولانا صاحب کی کوششیں اور زندگی بھر کی محنت رائیگاں ہو جاتی۔ اور ان کے ہاتھوں لگائے ہوئے پیڑ پودے انقلاب کی زد میں آجاتے۔ مگر قدرت نے آپکی محنت کے ثمر کو محفوظ رکھا اور آپ کی کمائی کو آپ کے فرزند ارجمند مولانا مفتی محمد احمد رحمانی کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔

مفتی محمد احمد رحمانی ایک نوجوان صاحب ہمت، دُور بین اور سیچے کردار کے انسان ہیں۔ مولانا صاحب کے مشن کو آگے چلانے اور عوام میں اپنایت اور وفاداری کی رُوح پھونکنے کے لئے آپ لدھیانہ میں تشریف لے آئے ہیں۔

(باقی صہ پر)

میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

(حضرت مولانا مفتی عبدالحمید صاحب لدھیانوی)

برادرم مولوی محمد احمد رحمانی سلمہ اللہ تعالیٰ اکرمہ

بعد سلام مسنون و ادعیہ کثیرہ آنکہ خیریت سے ہوں امید کہ بعافیت ہونگے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمان مرحوم و مغفور کی یاد تازہ کرنے اور تمہاری فرمائش پوری کرنے کی غرض سے چند سطریں تحریر کی ہیں ورنہ مرحوم کے حالات پر کچھ لکھنا اہل قلم حضرات کا کام ہے۔ مجھ جیسے کے بس کی بات نہیں۔

(دعاگو۔ عبدالحمید لدھیانوی ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائلپور)

یزید ابن مہلب کو تاج و تخت سے دستبردار ہو کر راہِ فرار اختیار کرنے کے سوا چارہ نہ رہا تو اپنے ایک وفادار غلام کے ساتھ بمشکل جان بچا کر بھاگا۔ مایوسی اور پریشانی کے علاوہ سفر میں بھوک سے جاں بلب ہو گیا تو راستہ میں ایک بڑھیا سے کھانا طلب کیا۔ بڑھیا نے کہا کہ جنگل میں اس وقت کھانا کہاں؟ ایک بکری موجود ہے اس کا دودھ نکالو اور پیو۔ دودھ پینے کے بعد یزید ابن مہلب نے غلام سے دریافت کیا کہ تمہارے پاس کچھ ہے اس نے جواب دیا کہ سو اشرفیاں ہیں۔ یہ سنتے ہی غلام کو حکم دیا کہ بڑھیا کو دے دو۔ غلام با ادب عرض کرنے لگا کہ جان بچا کر بھاگے ہیں۔ در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ سوائے ان اشرفیوں کے اور کچھ نہیں ہے بہتر ہے انہیں ضائع نہ کریں۔ پتہ نہیں کب اور کیسی صورت حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ بڑھیا بہت غریب ہے اسے یہ خبر نہیں کہ آپ کون ہیں۔ دو چار اشرفیاں لے کر بھی خوش ہو جائیگی۔ غلام کی یہ بات سُنکر یزید ابن مہلب تڑپ اُٹھا اور غلام کو حکم دیا کہ تمام اشرفیاں بڑھیا کو دیدے۔ بیشک بڑھیا کو خبر نہیں میں کون ہوں۔ لیکن "مجھے خبر ہے کہ میں کون ہوں۔"

بعض نامور شخصیتوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ نامساعد حالات میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ میں کون ہوں اور ایسے وقت میں شایانِ شان نہیں بلکہ اپنی حیثیت سے گرے ہوئے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

مجاہد ملت مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم و مغفور کو جن حضرات نے قریب سے دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم کو یہ احساس ہر وقت دامنگیر تھا کہ "میں کون ہوں" جس کسی سے جس قسم کے بھی تعلقات تھے ان میں سیاسی کشمکش۔ قید و بند کی صعوبتیں۔ معاشی ناہمواریاں اور فرا ستدادی کی تلخیاں۔ غرضیکہ کیسے ہی ناخوشگوار حالات کیوں نہ ہوں اس مجاہد نے ان میں کبھی سرمو بھی فرق نہیں آنے دیا اور کسی حال میں بھی فراموش نہیں کیا کہ "میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیئے" ابت المکارم ان یجارق اھلہا۔ اکابر سے ملتے تو بیکیں اخلاص و وفا بن کر اور اصاغر سے شفقت و مہربانی کا سلوک! یہ میری ہی رائے نہیں بلکہ مولانا مرحوم کے مخالفین کو بھی اس کا اعتراف ہے والفضل ما شہدت بہ الاعداء۔ اس مجاہد ملت نے دو مکتوب جو برادر محترم مولانا عبدالحمید صاحب مرحوم کی وفات پر بندہ کے نام تحریر کئے روانہ کر رہا ہوں۔ ان میں سے ۹ اکتوبر ۵۰ء کے مکتوب میں نہایت مختصر الفاظ میں یوں تحریر ہے کہ "تم جانتے ہو کہ میرا تعلق تم سب سے کتنا تھا اور رہے گا"

اس ایک فقرہ سے اندازہ کیجئے کہ انقلاب زمانہ، خاندانی معاملات کی تلخیاں اور بُعد مکانی مجاہد ملت کے اس احساس کو مغلوب نہ کر سکا کہ "میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیئے" ۵

۵ حق تعالیٰ مرحوم کو اپنے فضل و کرم سے جوار رحمت عطا فرمادے۔ آمین!

مولانا عبدالباقی لکھنا

آہ! مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

وجود اور عدم کو سمجھ کے ہستی میں
تعینات سے گزرا وہ مرد آفاقی

رئیس الاحرار کے انتقال پر روزنامہ پیام وطن کا اداریہ جس کے لکھنے والے مولانا عبدالباقی ہیں - یہ اداریہ ایک تاریخی اداریہ ہے - ناظرین الحبیب کی تاریخی معلومات کے لئے شامل اشاعت کیا جا رہا ہے -
(ایڈیٹر)

بطل حریت رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کا انتقال ہو گیا - اور وہ کتاب زندگی ختم ہوئی جو چونسٹھ برسوں تک جہد مسلسل اور عزم مستقیم کی ایک ضخیم کتاب تھی - ابھی پرسوں کی بات ہے کہ مولانا سے ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ پرسوں کئی گھنٹے تک اہم مسائل پر احباب سے تبادلہ خیالات کرتے رہے اور حسب عادت مفید مشورے بھی دیتے رہے اور کل جب ان کا انتقال ہوا وہ نماز فجر کے بعد سیر کو بھی گئے - وہاں سے آ کر چائے پی اور دفعتہً اُن کی طبیعت بگڑی اور سیاسی و مذہبی انجمنوں کا دھڑکتا ہوا دل یکایک خاموش ہو گیا -

آج کہ مولانا ہم میں نہیں ہیں ایک حقیقت کے اظہار میں ہمیں تامل نہ ہونا چاہیے "پیام وطن" سے مولانا کے جو تعلقات تھے اس کے بارے میں بعض حلقوں نے بہت کچھ کہا، کیا کہا؟ اس پر ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی - لیکن اگر ہم اپنی دیانت اور صداقت کو گواہ بنا سکتے ہیں تو ہمیں کہنا چاہیے کہ مولانا کو پیام وطن والوں سے بے انتہا محبت تھی اور پیام وطن والے انہیں اپنا بزرگ اور مخلص سمجھتے تھے اور اس کے سوا ہمارے اور ان کے درمیان مادی دنیا کا کبھی کوئی رشتہ نہیں رہا -

۱۹۲۹ء میں پنجاب "پیام وطن" کے ایک خادم کی عملی زندگی کا محور بنا - ہم نوجوان تھے اور مولانا ابھی جوان تھے - اور بڑھاپے کی منزل ان سے دور تھی - ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ مولانا نے اس وقت ہمیں کیا سمجھا؛ لیکن ہم نے یہ سمجھا کہ مولانا ایک مجاہد ہیں - اور اگر ان کا ذہن استوار ہو جائے اور شباب کی ہنگامہ آرائیاں ختم ہوں - تو وہ افق سیاست پر آفتاب بن کر چمکیں گے - تقسیم ملک کے بعد دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی - تو مولانا کا ذہن وہ تھا جو ہم چاہتے تھے - جوش و خروش اب بھی تھا جو ۱۹۲۹ء میں تھا اور ذہن آئینہ کی طرح صاف تھا - سیاسی و مذہبی مسائل کی الجھنیں سلجھ چکی تھیں - مرنا سب کو ہے - لیکن مولانا کی موت ان کی مسلسل علالت کے باوجود ہمارے نزدیک بے وقت موت ہے اس لئے کہ زمانہ کا نشیب و فراز دیکھنے کے بعد ان کے کردار اور فکر میں جو پختگی آئی تھی - اس پر شباب اب آنا - مولانا جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے - تو یہ ان کے لئے کوئی خاص بات نہیں تھی - لیکن ہمارے لئے ایک خاص بات ضرور تھی - اس لئے کہ ہم نے سمجھا تھا کہ ایک شاندار ابتدا کی نتیجہ خیز انتہا یہ ہونی چاہیے کہ مولانا ایک دن آل انڈیا کانگرس کے صدر منتخب ہوں اور یہ محض خوش فہمی نہیں تھی - ہمارے نزدیک واقعات کی سیدھی رفتار تھی - پنڈت نہرو نے اُن کی موت پر جو یہ فرمایا ہے کہ "مولانا کی موت ایک قومی نقصان تو ضرور ہے - مگر میرا ذاتی نقصان بھی ہے تو یہ بے سبب نہیں ہے - واقعہ یہ ہے کہ مولانا نئے ہندوستان کا اعتماد حاصل کر رہے تھے -

ہمیں مولانا کو جاننے کا شرف چھبیس ستائیس سال سے حاصل ہے - اس لمبی مدت میں مولانا ہم سے بیزار بھی رہے - لیکن ہماری زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا کہ مولانا کا حب وطن، حب اسلام ان کی مجاہدانہ عزیمت، ان کا ایمان محکم - ان کا اخلاص ہماری رائے میں مسلمات کا درجہ نہ رکھتا ہو - تقسیم ملک سے پہلے مجلس احرار اسلام سے بعض معاملات

میں بھی اختلاف تھا۔ لیکن اختلافات کی حدیں صرف مولانا نے باندھیں۔ اس لئے کہ وہ وطن پرور تھے۔ مفاد وطن اور مسلمانوں کے مفاد میں مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور صحیح الفکر جوانوں کی قدر کرتے تھے۔ مجلس احرار اسلام کی مولانا نے وقتاً فوقتاً جو صحیح رہنمائی کی اسے وہ لوگ جانتے ہیں جو احرار کی داخلی سیاست سے بے خبر نہیں ہیں، وہ حالات سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے اور اپنے ان رفقا کی انہوں نے برملا تائید کی۔ جن سے زندگی کے معاہدے تھے۔ اور یہ اس کے باوجود تھا کہ مولانا اپنے رفقا کے وفادار تھے اور اس وفاداری کی وجہ سے انہوں نے حالات سے بہت سی مفاہمتیں کیں۔ اپنے رفقا سے جیسی وفاداری ہم نے مولانا میں دیکھی، ہندوستان میں کم ہی دیکھی۔ مولانا چاہتے تو اپنے لئے ایک الگ راہ بھی پیدا کر سکتے تھے اور سیاسی میدان میں بہت آگے ہوتے۔ لیکن رفقا کے ساتھ چلنا، انہیں اپنے خیالوں کے سانچے میں ڈھالنا، کچھ ان کی ماننا، کچھ اپنی منوانا اور اس طور پر سعی و عمل کی ایک ملی جلی راہ پیدا کرنا، مولانا ہی کا حصہ تھا۔ کم سے کم ہندی مسلمانوں میں یہ بات ہم نے کم ہی دیکھی۔ کبھی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری روٹھ رہے ہیں، کبھی چودھری افضل حق مرحوم تن رہے ہیں، کبھی مولانا مظہر علی اظہر بگڑ رہے ہیں — کبھی نوجوانوں کا طبقہ اینٹھ رہا ہے۔ اور ان مشکل حالات میں مولانا اپنی لیڈری اور قیادت کو داؤ پر لگا کے ایک راہ پیدا کیا کرتے تھے۔ جس پر سب ہی چلتے تھے۔ انگریزی نہ جاننے کے باوجود مولانا حبیب الرحمان کا شمار ہماری رائے میں ان اکابرین میں ہونا چاہیے جو مولانا محمد علی مرحوم کے بعد ہندوستان کی سیاست پر چھا سکتے تھے۔ مولانا محمد علی میں اخلاص کا جو ہنگامہ، شورش و خروش تھا۔ وہ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی میں بھی تھا۔

ایک مقامی معاصر نے لکھا ہے کہ مولانا سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ پھر بھی ان کا دم غنیمت تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ اپنی زندگی کے آخری دور میں مولانا نے کبھی خاموشی سے کبھی علانیہ، نئے ہندوستان کی جو خدمت کی وہ انہی کا حصہ تھی۔ گو چہ رائگان ہیں ان کا گھر ایک یونیورسٹی تھا۔ ایک مکتب خیال تھا۔ جہاں ہندو، مسلمان، سکھ، نیشنلسٹ، کمیونسٹ، سوشلسٹ، کانگریسی، مسلم لیگی، سب ہی آتے تھے اور مولانا کے منجھے ڈھلے افکار سے استفادہ کرتے تھے۔ ان کے ماننے والے کمیونسٹوں میں بھی تھے، کانگریسیوں میں بھی تھے۔ وہ بجائے خود ایک انجمن اور افادہ گاہ تھے اور ان کا دم غنیمت ہی نہیں تھا۔ بلکہ نئے ہندوستان کی ایک بہت بڑی ضرورت تھا۔ سیاست پر ان کی رائے معلوم تھی۔ لیکن تبلیغ دین کا بھی جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا۔ وہ بالکل اچھوتا اور نرالا تھا اور یہ بات ہم کہنی چاہتے ہیں کہ تبلیغ دین سے زندگی کی آخری ساعت تک انہیں غیر معمولی دلچسپی رہی۔ لیکن یہ تبلیغ جہاد کے لئے نہیں تھی، رسمی قسم کے مناظروں کے لئے نہیں تھی بلکہ اس مقصد عظیم کے لئے تھی جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں رسالہ "معارف" اور دوسرے رسالوں میں انہوں نے جو مضامین لکھے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینی و تاریخی مسائل پر انہیں پورا عبور تھا۔ اور سیاست کے متعلق تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ انہوں نے اتنی صاف بات کہی جو ۱۹۴۷ء کے بعد نہیں کہی گئی تھی۔ اس لئے ان کی ذہنی دیانت کے بارے میں تو دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔

خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے اپنے پیچھے کچھ ہم خیال بھی چھوڑے ہیں اور اپنے صاحبزادوں کو قوم اور سماج کی خدمت کے لئے تیار کیا ہے۔ اور یہ حضرات ان کی زندگی ہی میں بہت سے معرکے سر کر چکے ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ مولانا کے پیش نظر سو سال یا ڈیڑھ سو سال کی جو عظیم الشان خاندانی روایات تھیں، وہ ان کے صاحبزادہ اور صاحبزادوں کے پیش نظر بھی ہوں گی ؎

چہچہوں سے یوں تو ہے معمور بزم رنگ و بو
چاہیے وہ ایک نالہ جو ہو شرح آرزو
جو نہ آساں ہو سکے اور ایسی کوئی منزل نہیں
عزم پیہم زندگی میں سعی لاحاصل نہیں

خدمتِ خلق بود خلقِ حبیب الرحمان

(از حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رح)

۱۹۳۲ء میں رئیس الاحرار پانچویں بار گرفتار ہوئے۔ اور آزادی وطن کے عشق میں دو سال ملتان سنٹرل جیل میں قید رہے۔ ملتان سنٹرل جیل میں آپ کے ساتھ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رح۔ مولانا احمد سعید رح۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے لیڈران تھے۔ رئیس الاحرار مفتی کفایت اللہ صاحب رح سے پہلے رہا ہوئے۔ مفتی صاحب رئیس الاحرار کے اخلاق اور کردار سے متاثر تھے۔ آپ کی رہائی پر مندرجہ ذیل منظوم مفتی صاحب نے رئیس الاحرار کی شان میں کہی ———— (رحمانی)

رہائی

اے صدیقِ محترم لدھیانوی — لو تمہاری بھی رہائی آ گئی
اے شفیقِ قوم رحماں کے حبیب — آ گئی تیری جدائی آ گئی
دوستوں کو چھوڑ کر تو بھی چلا — آہ کیسی شاق ہے فرقت تری

قیامِ اسیری

تو رہا جب تک تو اپنی قید کو — قید سمجھا ہی نہیں کوئی کبھی
جیل کیا تھا محفلِ احباب تھی — اور تو تھا اس کی رونق روشنی
تو گیا تو اس میں کوئی شک نہیں — رونقِ بزمِ اسیراں بھی گئی
جیل کے عملے سے بالطف و خوشی — کاربرآری تری مخصوص تھی
جب کبھی الجھا کسی کا کوئی کام — تو نے سلجھایا بہ لطف و آشتی

اخلاق

گرچہ باہر صدر تھا احرار کا — پر نہ برتی جیل میں کچھ برتری
زیب دیتی ہے قیادت بھی اسے — جو رہے زنداں میں بنکر لشکری
ہے سیاست خدمتِ قومی کا نام — قوم کے خادم کا حق ہے سروری

ساتھیوں کی خدمت

قیدیوں کی ہر طرح کی خدمتیں — تو نے کیں اے مستحقِ افسری
کچھ نہ سمجھا فرق خویش و غیر میں — سب کی یکساں دل سے خدمت تو نے کی
شیر و شکر ہو گئے تو ان میں رہا — رنج و راحت میں تری شرکت رہی
سب ترے مداح ہیں ممنون ہیں — تیری فرقت سے ہیں پژمردہ سبھی
اختلافِ رائے پر بھی دوست ہیں — کیونکہ سچی تھی تری بھی دوستی
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے پر تری — سچ یہی خدمات ہیں سب سے بڑی